علامہ اقبال کا تصورِ ملت —— عہدِ حاضر کے تناظر میں

ڈاکٹر نعیم احمد

مسلمان کون ہیں؟ وہ کونسا اصول ہے جو انھیں ایک سماجی وحدت میں مربوط کرتا ہے؟ ان کی سرزمین اور وطن کونسا ہے؟ وہ اہم خدوخال کیا ہیں جو بحیثیت قوم اور ملت انھیں دیگر اقوام وملل سے ممتاز و متبائن کرتے ہیں؟ ملتِ اسلامیہ کا مختلف اقوام عالم سے کیا تعلق ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جنھیں ہم فکر اقبال کا مرکز ومحور قرار دے سکتے ہیں۔ جب علامہ اقبال حصولِ تعلیم کے لیے یورپ گئے تو فطری طور پر یہ سوالات ان کے ذہن میں پیدا ہوئے۔ کوئی بھی شخص جب اپنے جمے جمائے ثقافتی اور جغرافیائی پس منظر سے نکل کر کسی نئی سرزمین، نامانوس تہذیب وثقافت اور اجنبی معاشرت میں بود وباش اختیار کرتا ہے تو اسے مغائرت (Alienation) کا ایک شدید ترین احساس ہوتا ہے جسے ماہرین عمرانیات ثقافتی جھٹکا (Cultural Shock) کہتے ہیں۔ علامہ کو بھی اس ثقافتی جھٹکے کا تجربہ ہوا جس کے نتیجے میں ان کے ذہن میں یورپی تہذیب وثقافت کے بارے میں متعدد سوالات ابھرے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے بارے میں اور اپنی قوم (یعنی مسلمانوں) کے بارے میں بھی کئی سوالات پیدا ہوئے۔ مبدا فیض سے انھیں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیتیں، بے پناہ قوتِ مشاہدہ اور انتہائی حساس طبیعت عطا ہوئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے گہری نظر سے یورپی تہذیب کے حسن وقبح کا جائزہ لیا اور علمی انداز میں اس کا تجزیہ کیا۔ نہ صرف یورپی تہذیب بلکہ اپنے آپ کے توسط سے انھوں نے پوری ملت اسلامیہ کی صورتِ حال کا جائزہ بھی لیا۔ وہ تہذیبِ فرنگ کے علمی وتحقیقی حاصلات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انھیں قابلِ تقلید سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے قوم پرستانہ جذبات اور لسانی ونسلی تعصّبات کو انتہائی مہلک اور ضرر رساں سمجھتے ہیں اور اس معاملے میں مغرب کی تقلید کو ملت اسلامیہ کے لیے خطرۂ عظیم قرار دیتے ہیں۔ علامہ نے ایک طویل عرصے تک مغربی وطنیت اور جمہوریت کا مطالعہ کیا اور اس کے مضمرات کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ لیا۔ وہ کہتے ہیں:

> میں نے اپنی عمر کا نصف حصہ اسلامی قومیت اور ملت کے اسلامی نقطۂ نظر کی تشریح وتوضیح میں گذارا ہے محض اس وجہ سے کہ مجھ کو ایشیا کے لیے اور خصوصاً اسلام کے لیے فرنگی سیاست کا یہ نظریہ خطرۂ عظیم محسوس ہوتا تھا۔[1]

فرد اور ملت کے تعلق اور ملت کی ہیئت و اساس کے بارے میں علامہ کے نظریات ان کے مجموعی فکر میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی شاعری اور نثر میں ہمیں جگہ جگہ انھی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ علامہ ایک ایسے فلسفی ہیں جنھوں نے خدا، حیات اور کائنات کے بارے میں ایک مربوط نظریہ پیش کیا ہے۔ یہ نظریہ ایسا ہے کہ اس میں حیات اور ارادے کی اولیت کو پیش کیا گیا ہے۔ فلسفیانہ اصطلاح میں اسے ارادیت پسندی (Voluntarism) کہا جا سکتا ہے۔ علامہ اگرچہ خدا کو ہی تمام کائنات کا اساسی اصول سمجھتے ہیں، تاہم وہ روایتی وحدت الوجود کو اس لیے پسند نہیں کرتے کہ اس میں فرد کی نفی ذات ہو جاتی ہے اور وہ وحدتِ مطلقہ میں یوں گم ہو جاتا ہے جس طرح قطرہ دریا میں۔ اس کے برعکس علامہ اقبال فرد کی تمام تر انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے، اسے حقیقت مطلقہ کے اندر شامل کرتے ہیں۔ ذیل میں ہم مختصراً ان کے مابعد الطبیعیاتی نقطۂ نظر کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں کیونکہ اس سے ہم علامہ کے فرد اور ملت کے نظریے کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

——(۱)——

حقیقت مطلقہ کی کُنہ تک پہنچنے کے لیے علامہ اقبال شعوری تجربے کا تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شعوری تجربہ تین سطحوں پر اپنا اظہار کرتا ہے۔ مادے کی سطح پر، حیات کی سطح پر اور شعور کی سطح پر! یہ تینوں سطحیں علی الترتیب طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات کے موضوعاتِ مطالعہ ہیں۔[۲]

مادے کے بارے میں شروع سے ہی یہ نظریہ عوام و خواص کے لیے بدیہی اور ناقابلِ تردید حیثیت کا حامل رہا ہے کہ یہ خارجی فضائے بسیط میں معروضی طور پر موجود ہے۔ مادے کی طرح مکان (Space) کو بھی معروضی حیثیت دی جاتی رہی ہے۔ مادے کو چھوٹے چھوٹے ٹھوس اور جامد اجزائے لایتجزّیٰ پر مشتمل سمجھا جاتا تھا جو خلا یا مکان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اشیاء انھی مادّی جواہر پر مشتمل ہیں اور یہ جواہر ہی حقیقی وجود رکھتے ہیں۔ انھی جواہر یا مادّی اجزاء کے مجموعوں کا مطالعہ طبیعیات کرتی ہے۔ طبیعیات کے لیے حسی تجربے کی اطلاعات ہی حرف اوّل و حرف آخر ہیں۔ مادّی عالم کا یہ وہ تصور ہے جو کہ ارسطو کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ یعنی کہ یہ تکمیل شدہ اور ناقابلِ نشو و نما شئے ہے جو کہ مکان کے اندر واقع ہے۔ لیکن مادّی عالم کا یہ تصور اس وقت سطحی اور مصنوعی محسوس ہونے لگتا ہے جب ہم تحسّسات کی نوعیت و ماہیت پر غور کرنا شروع کرتے ہیں۔ اکثر تحسّسات موضوعی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ہمارے مخصوص نظامِ ادراک اور ذہن کے آفریدہ ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر برکلے اور ہیوم نے بڑی مفصل اور مدلل بحثیں کی ہیں۔ جس طرح مادّی کائنات کا تصور موضوعی اور ذہنی ہے، اسی طرح خلا یا مکان بھی ہمارے ذہن کی پیداوار ہے جس کی کوئی معروضی حیثیت نہیں۔ چنانچہ آئن سٹائن کی طبیعیات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ مادّی کائنات دراصل ''باہم دگر مربوط

حوادث یا وقوعات کا ایک نظام ہے''۔[۳] وہائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ کائنات عضویہ یا نامیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ کائنات کا مادّی تصور غلط ہے تاہم وہ خارجی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں یعنی عالم اور معلوم یا شاہد ومشہود کی دوئی ضرور پائی جاتی ہے۔[۴] اس خارجی حقیقت کا کشف نہ حسی ادراک سے ممکن ہے اور نہ عقل سے بلکہ اس تک رسائی صرف وجدان سے ہوسکتی ہے۔

تجربے کا دوسرا درجہ حیات ہے۔ حیات کو علامہ حرکت قرار دیتے ہیں جو کہ ہر لحہ آگے کی طرف بڑھتے ہوئے نت نئی شکلوں کی تخلیق کر رہی ہے۔ اس کا تخلیقی سفر میکانکی نہیں بلکہ سراسر تخلیقی ہے۔ یہ ایک ایسی حرکت ہے جو کسی پہلے سے کھنچے ہوئے خط پر جاری وساری نہیں اور نہ ماضی کٹ کر اس کے پیچھے رہ جاتا ہے بلکہ ماضی حال کے لمحے میں جمع ہو کر اسے فزوں تر کرتا جاتا ہے اور مستقبل اس کے سامنے ایک کھلے امکان کی صورت میں ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ پیش گوئی کرنا کہ حیات آیندہ کونسی شکل اختیار کرے گی ممکن نہیں۔ حیات دراصل ایک ارادہ یا مشیت ہے جو کہ حرکتِ محض یا دورانِ خالص (Pure Duration) کی صورت میں آزادانہ طور پر ارتقا پذیر ہے۔

تجربے کا تیسرا درجہ شعور ہے جو کہ حیات ہی کا ایک مظہر ہے۔ یہ درحقیقت ایک روحانی اصول ہے جو حیات کی تخلیقی پیش قدمی کے لیے چراغِ راہ کا کام کرتا ہے۔ بعض فلسفے شعور کو مادّی اور میکانکی اعمال کا ایک پس مظہر (Epiphenomenon) قرار دیتے ہیں جو کہ سراسر غلط ہے کیونکہ اس طرح شعور کی آزاد اور تخلیقی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے علم کا بھی ابطال ہو جاتا ہے کیونکہ علم دراصل شعور کا ہی ایک منظّم اور مربوط اظہار ہے۔ اس لیے شعور کو ایک روحانی اصول اور حیات کا پیدا کردہ ایک نقطۂ نور سمجھنا چاہیے جو کہ میکانکی تشریحات اور مادّی حدود وقیود سے بالاتر ہے۔

اب علامہ کہتے ہیں کہ حقیقت مطلقہ میں مادّہ، حیات اور شعور باہم دگر مدغم اور متحد ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اسے ایک بابصر اور خلاق مشیت یا ارادہ کہا جا سکتا ہے۔ بابصر اس لیے ہے کہ یہ غایات ومقاصد سے عاری نہیں اور یہ غایات ومقاصد اس کے اندر موجود ہیں، باہر نہیں۔ اس بابصر، آزاد اور خلّاق مشیت کو علامہ اناے مطلق (Supreme Ego) کا نام دیتے ہیں۔ اناے مطلق کو اپنی انا اور اپنے نفس کے حوالے سے دیکھنا ہماری ایسی مجبوری ہے جس سے کوئی مفر نہیں۔ ''انسان عالم کو اور خدا کو اپنے اوپر قیاس کرتا ہے اور اس سے گریز محال معلوم ہوتا ہے''۔[۵]

اناے مطلق سے انائیں ہی ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ جس طرح سورج سے کرنوں اور شعاعوں کا فیضان ہوتا ہے، اسی طرح اناے مطلق سے اناؤں کا فیضان یا صدور ہوتا ہے۔ علامہ کہتے ہیں:

حقیقت مطلقہ کا تصور بطور ایک انا ہی کے کرنا چاہیے اور اس لیے میرے نزدیک انیتِ مطلقہ سے انیتیں (یعنی

خودیاں یا Ego) ہی ظہور پذیر ہو سکتی ہیں یا پھر دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ انیتِ مطلقہ کی تخلیقی قدرت کا اظہار جس میں عمل کو فکر کا مترادف سمجھنا چاہیے، ان وحدتوں کی شکل میں ہی ہوتا ہے جن کو ہم 'انا' سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا کائنات کا ہر عمل، خواہ اس کا تعلق مادّی جواہر کی میکانکی حرکت سے ہو، یا ذاتِ انسانی میں فکر کی آزادانہ کارفرمائی سے، سب کی حقیقت ایک عظیم اور برتر انا کے انکشافِ ذات کے سوا اور کچھ نہیں۔ لہٰذا قدرت الٰہیہ کا ہر جوہر خواہ اس کا درجۂ ہستی پست ہو یا بلند، اپنی ماہیت میں ایک 'انا' ہے یہ الگ بات ہے کہ انیت یا خودی کا بھی ایک درجہ ہے، بڑا اور چھوٹا! بہ ایں ہمہ بزمِ ہستی میں ہر کہیں خودی ہی کا نغمہ لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہا ہے اور ذاتِ انسانی میں اپنے معراجِ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی تو اسی لیے حقیقتِ مطلقہ کو انسان کی رگِ جاں سے بھی قریب تر ٹھہرایا ہے کیوں کہ یہ حیاتِ الٰہیہ کا سیل رواں ہے جو ہمارے وجود کا سرچشمہ ہے اور جس میں ہم موتیوں کی طرح پیدا ہوتے اور زندگی بسر کرتے ہیں۔[۶]

علامہ کے نزدیک پوری کائنات اناؤں سے عبارت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس انا یا خودی کو اپنے ہونے کا وجدان جس درجے کا ہوتا ہے یا وہ جس شدت سے اپنا ادّعاے ذات کرتی ہے، اسی تناسب سے مراتبِ ہستی میں اس کا درجہ بلند یا پست ہوتا ہے۔ وجود کے پست ترین درجے پر مادّی جواہر ہیں جن کی حرکت میکانکی ہے اور جن میں اپنے ہونے کا وجدان انتہائی خفیف سا ہوتا ہے۔[۷] ان سے اوپر نباتات اور پھر حیوانات ہیں جن میں شعورِ ذات بتدریج بڑھتا جاتا ہے اور پھر انسانی خودی کے مقام پر آ کر مکمل آزادیِ فکر و شعور کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح علامہ کہتے ہیں کہ انسانی خودی دراصل اناے مطلق یا خدا کا ہی اظہارِ ذات ہے:

خودی را از وجودِ حق وجودے
خودی را از نمودِ حق نمودے

وہ اگرچہ اس بات کے قائل ہیں کہ انسانی خودی کا ظہور ذاتِ الٰہیہ سے ہوتا ہے، تاہم وہ روایتی وحدت الوجود سے پہلو بچاتے ہوئے کہتے ہیں ایک دفعہ وجود پذیر ہونے کے بعد انسانی خودی خدا سے متغائر و منفصل ہو کر ایک بالکل منفرد اور ذاتی حیثیت اختیار کر لیتی اور خود مختار فعلیت کی حامل بن جاتی ہے۔ خدا اور انسانی خودی کے باہمی تعلق کی وضاحت کے لیے وہ ایک خوبصورت اور نادر تشبیہ استعمال کرتے ہیں جس سے ان کا فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی موقف بالکل واضح ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ صدف کے اندر پانی کا قطرہ ٹپکتا ہے تو موتی بن جاتا ہے۔[۸] موتی اپنی اصل میں پانی ہے۔ تاہم قطرۂ آب سے گوہرِ تاب دار بننے کا مرحلہ طے کرنے کے بعد یہ پانی سے منفصل، متغائر اور متقابل وحدت بن جاتا ہے۔ یہی وحدت انسانی خودی ہے جو اپنی اصل میں الوہی اور روحانی ہے تاہم وجود پذیر ہونے کے بعد آزاد اور خود مختار بن جاتی ہے۔ وہ موتی کی طرح ذاتِ الٰہیہ کے سیلانِ رواں میں زندگی بسر کرتی ہے تاہم وہ قطرۂ آب کی طرح

اپنی نفی کر کے پانی کے سیلان میں مدغم نہیں ہو جاتی بلکہ اپنے آپ کو مزید مستحکم کر کے بقائے دوام حاصل کر لیتی ہے۔ چنانچہ علامہ کے نظریہ میں انسانی خودی کی آفرینش ایک مخصوص لمحۂ زمانی میں ہوتی ہے، تاہم ایک دفعہ وجود پذیر ہونے کے بعد یہ فنا نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ کے لیے قائم و دائم ہو جاتی ہے۔

مسلسل جدوجہد اور پیہم کاوش خودی کو ایسا استحکام بخشتی ہے کہ موت کا صدمہ بھی اسے متاثر نہیں کر سکتا اور خودی نہ صرف مادّہ پر بلکہ زمانہ پر بھی غالب آ جاتی ہے۔ استحکامِ خودی کے حوالے سے علامہ تین مراحل کا ذکر کرتے ہیں: (۱) دستورِ الٰہی کی اطاعت (۲) ضبطِ نفس (۳) نیابتِ الٰہی۔ عشق کی قوتِ محرکہ نہ صرف خودی کو جادۂ ارتقا پر مسلسل مصروفِ عمل رکھتی ہے بلکہ صفاتِ الٰہیہ کے انجذاب کا باعث بھی بنتی ہے جس سے خودی مستحکم تر ہوتی جاتی ہے اور اس کے سامنے نت نئے امکانات ابھرتے رہتے ہیں۔[۹]

علامہ کہتے ہیں کہ خودی دو سطحوں پر اپنی زندگی بسر کرتی ہے۔ ایک سطح اس کی خلوت کی ہے اور دوسری اس کی جلوت کی۔ خلوت میں خودی اپنی اصل یعنی حقیقتِ مطلقہ یعنی انائے مطلق سے رابطہ قائم کرتی ہے اور دورانِ خالص (Pure Duration) کا تجربہ کرتی ہے جس میں تمام ماضی سمٹ کر ایک نقطہ میں جمع ہو جاتا ہے اور مستقبل پہلے سے کشیدہ خط نہیں بلکہ کھلا امکان بن جاتا ہے اسے علامہ اپنی اصطلاح میں نفسِ بصیر (Appreciative Self) کہتے ہیں۔ جلوت میں خودی ریاضیاتی زمان (Mathematical Time) کی سطح پر سرگرم ہوتی ہے اور منطقی سوچ اپناتی ہے۔ یہ وہ دنیائے آب و گل کی مظہری سطح ہے جس کی تشکیل خودی کے مقولاتِ فکر (Categories of Tought) کرتے ہیں۔ اس کو علامہ نفسِ فعال (Efficient Self) کہتے ہیں۔

خودی جب مستحکم اور پختہ ہو جاتی ہے یعنی جب قطرہ گہر بن جاتا ہے یا زغال الماس بن جاتا ہے تو پھر اسے موت کا صدمہ بھی متاثر نہیں کر سکتا اور یہ انائے مطلقہ کی حقیقی نمائندہ بن جاتی اور نیابتِ الٰہیہ کا استحقاق حاصل کر لیتی ہے۔ یہاں پہنچ کر دائرہ ہستی مکمل ہو جاتا ہے۔

—— (۲) ——

الغرض خودی علامہ کے نزدیک اپنی اصل کے لحاظ سے ایک روحانی وحدت ہے جو کہ حیاتِ الٰہیہ کے سیلانِ رواں میں موتی کی طرح وجود پذیر ہوتی ہے۔ حیات، شعور اور مادّہ اس کے اندر گھلے ملے ہوئے ہیں اور غایات و مقاصد اس کے اندر سے ابھرتے ہیں۔ یہ کسی خارجی مقصد کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل نہیں ہوتی بلکہ اپنے داخلی مقاصد کے حصول اور اپنی خفتہ صلاحیتوں کے اظہار کے لیے فعال و متحرک رہتی ہے۔ جس طرح زندگی پرندوں میں پر، درندوں میں دانت اور پنجے اور دیگر ذی روح مخلوقات میں حسبِ ضرورت اعضاء و جوارح تخلیق کرتی ہے اسی طرح انسانی خودی نے عالمِ آب و گل میں اپنے رہنے کے لیے جسم و دماغ اور دیگر عضویاتی نظام تخلیق کیے ہیں۔

کیا انسانی خودی اپنی داخلی غایات اور باطنی امکانات کی تکمیل اور ان کا حصول خود اپنے طور پر یعنی کسی سماجی تناظر یا گروہی پس منظر کے بغیر کر سکتی ہے؟ کیا ایک فرد اپنی جماعت سے کٹ کر اپنی جسمانی، ذہنی اور نفسی تربیت کر سکتا ہے؟ علامہ اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اپنی جمعیت یا گروہ سے کٹا ہوا فرد ایک تجرید ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا میں ایسے رشی منی اور تارک الدنیا اشخاص بھی ہوتے ہیں جو اپنی زندگیاں غاروں اور گپھاؤں کی تنہائی میں بسر کر دیتے ہیں۔[۱۰] لیکن ایسے افراد اپنی خودی کی تربیت کرنے یا اسے استحکام دینے کی بجائے اپنی ذات کی نفی کرنے کی کوشش میں مصروف ہوتے ہیں لہٰذا انسانیت اور حیاتِ اجتماعی کے لیے ان کا وجود بے معنی ہوتا ہے۔

علامہ فرماتے ہیں کہ خودی کا استحکام ملت یا جمعیت کے بغیر ناممکن ہے۔ ایک فرد سماجی تناظر میں ہی اپنی خفتہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ استحکام خودی کا اصل مقصد بھی یہ ہے کہ یہ ملت کے اندر ضم ہو کر اجتماعیت کے استحکام کا سبب بنے۔ ایک اینٹ اپنے طور پر خواہ کتنی ہی پختہ اور مضبوط کیوں نہ ہو، یہ اگر دیوار میں چنی نہ جائے تو یہ بے کار اور بے مصرف ہے۔ لیکن اگر یہ دیوار کا حصہ بن جائے تو اسے بنیان مرصوص بنا دیتی ہے۔

واضح رہے کہ علامہ کے نزدیک جماعت یا ملت کی ایک اپنی زندگی اور انفرادیت ہوتی ہے۔ افراد یا اناؤں کا ملت میں ادغام ملت کے استحکام کا باعث بنتا ہے جس کے نتیجے میں افراد یا انائیں بھی مستحکم اور پائیدار ہو جاتی ہیں، تاہم یہ ضروری نہیں کہ کسی خودی یا انا کے ذاتی اغراض و مقاصد ملت کے اجتماعی اغراض و مقاصد سے ہم آہنگ یا ان کے غماز ہوں۔ بعض اوقات خودی کی انفرادی غایات، ملت کی اجتماعی غایت سے متصادم اور متخالف ہو سکتی ہیں۔

علامہ حیات یا ارادے کی اولیت کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حیات نے ہی اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے عضویہ اور اس کے مختلف اعضاء و جوارح تخلیق کیے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی بیماری یا روگ عضویہ کو لاحق ہوتا ہے تو عضویہ اپنے اندر ہی سے اس کے خلاف مدافعت پیدا کرتا ہے اور بعض عصبی اور جسمانی تبدیلیاں پیدا کر لیتا ہے اور اکثر اوقات اس روگ یا بیماری سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ سوسائٹی یا معاشرہ بھی عضویہ کی طرح اپنا ایک مستقل بالذات وجود رکھتا ہے جو کہ اس کے اجزائے ترکیبی یعنی افراد و اشخاص سے ماورا اور بالا تر ہوتا ہے۔ معاشرہ افراد کا ایک میکانکی مجموعہ نہیں جس میں اشخاص خرمن کے دانوں کی طرح ڈھیر ہوں۔ افراد و اشخاص معاشرے سے نامیاتی طور پر مربوط و منسلک ہوتے ہیں۔ تاہم ''معاشرتی خودی'' یا ''حیات اجتماعیہ'' اپنا ایک علیحدہ اور مستقل بالذات وجود رکھتی ہے جس کے اپنے مقاصد و غایات ہیں جو کہ موجودہ صورتِ حال کے علاوہ مستقبل کے امکانات سے بھی تعلق رکھتے ہیں:

فرد اس جماعت کی زندگی میں جس کے ساتھ اس کا تعلق ہے بمنزلہ ایک عارضی اور آنی لمحہ کے ہے، اس کے

خیالات، اس کی تمنائیں، اس کا طرزِ ماند و بود، اس کے جملہ قوائے دماغی و جسمانی، بلکہ اس کے ایام زندگانی کی تعداد تک، اس جماعت کی ضروریات وحوائج کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جس کی حیات اجتماعی کا وہ محض ایک جزوی مظہر ہے، فرد کے افعال کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ برسبیل اضطرار و بلا ارادہ کسی ایک خاص کام کو جو جماعت کے نظام نے اس کے سپرد کیا ہے، انجام دے دیتا ہے اور اس لحاظ سے اس کے مقاصد کو جماعت کے مقاصد سے تخالفِ کلی بلکہ تضادِ مطلق ہے جماعت کی زندگی بلحاظ اپنے اجزائے ترکیبی یعنی افراد کی زندگی کے بالکل جداگانہ ہوتی ہے اور جس طرح ایک جسم ذوی اعضاء مریض ہونے کی حالت میں بعض دفعہ خود بخود بلاعلم وارادہ اپنے اندر ایسی قوتوں کو برانگیختہ کر دیتا ہے جو اس کی تندرستی کا موجب بن جاتی ہیں، اس طرح ایک قوم جو مخالف قوتوں کے اثرات سے سقیم الحال ہوگئی ہو بعض دفعہ خود بخود ردِعمل پیدا کرنے والی قوتوں کو پیدا کر لیا کرتی ہے۔ مثلاً قوم میں کوئی زبردست دل و دماغ کا انسان پیدا ہو جاتا ہے یا کوئی نیا تخیل نمودار ہوتا ہے یا کوئی ہمہ گیر مذہبی اصلاح کی تحریک بروئے کار آتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قوم کے قوائے ذہنی و روحانی تمام باغی و سرکش قوتوں کو اپنا مطیع و منقاد بنانے اور اس موادِ فاسد کو خارج کر دینے سے جو قوم کے نظام جسمانی کی صحت کے لیے مضر تھا، قوم کو نئے سرے سے زندہ کر دیتے ہیں اور اس کی اصلی توانائی اس کے اعضاء میں عود کر آتی ہے۔ اگرچہ قوم کی ذہنی اور دماغی قابلیت کا دھارا افراد کے دماغ میں سے ہو کر بہتا ہے مگر پھر بھی قوم کا اجتماعی نفسِ ناطقہ جو مدرکِ کلیات اور جزئیات اور خبیر و مرید ہے بجائے خود ضرور موجود ہوتا ہے۔ ''جمہوری رائے اور قومی فطنت'' وہ جملے ہیں جن کی وساطت سے ہم موہوم و مبہم طور پر اس نہایت ہی اہم حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ قومی ہستی ذوی العقل اور ذوالارادہ ہے۔ ازدحامِ خلائق، جلسۂ عام، جماعتِ انتظامی، فرقۂ مذہبی اور مذہبی مشاورت، وہ مختلف ذرائع ہیں جن سے قوم اپنی تدوین و تنظیم کا کام لے کر وحدتِ ادراک کی غایت کو حاصل کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قومی دماغ تمام ان مختلف خیالات کی خبر یا علم رکھتا ہو جو ایک وقتِ خاص میں افراد کے دماغوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ خود افراد کا دماغ بھی کامل طور پر اپنی ادراکی حالتوں سے آگاہ نہیں ہوتا۔ اجتماعی یعنی قومی دماغ میں بہت سے احساسات و مقامات و تخیلات قومی حاسہ کی دہلیز سے باہر رہتے ہیں۔ قوم کی ہمہ گیر دماغی زندگی کا فقط ایک جزو محدود دروازہ کے اندر قدم رکھتا ہے اور قومی ادراک کی تابناک شعاعوں سے منور ہوتا ہے۔ اس انتظام کی بدولت مرکزی اعضاء کی توانائی کی ایک بہت بڑی مقدار غیر ضروری جزئیات پر صرف ہونے سے محفوظ رہتی ہے۔[۱۱]

علامہ کے اس اقتباس سے ان کے مخصوص عمرانی نظریے کا مرکزی نقطہ وضاحت سے سامنے آ جاتا ہے۔ فرد اور معاشرے کا تصور دراصل ان کے مجموعی نظامِ فکر کا ہی ایک حصہ ہے جس میں حیات اور ارادے کو اولیت حاصل ہے اور جو تخلیق و ارتقا کی نئی نئی شکلیں پیش کرتا مسلسل آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ متناہی اور انفرادی خودی استحکام اور تربیت کے بعد قومی یا اجتماعی خودی میں ضم ہو جاتی ہے۔ اجتماعی خودی کا حافظہ

اس کی تاریخ ہے جو اس کا تشخص برقرار رکھتی ہے۔ آنے والی نسلوں اور ان کے ارتقا کے امکانات اس کے اندر ہی مضمر ہوتے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں:

> قوم ایک جداگانہ زندگی رکھتی ہے ۔۔۔۔۔ قوم اپنے موجودہ افراد کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ اس سے بہت کچھ بڑھ کر ہے ۔۔۔۔۔ یہ غیر محدود اور لامتناہی ہے ۔۔۔۔۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں وہ کثیر التعداد آنے والی نسلیں بھی شامل ہیں جو اگرچہ عمرانی حدِ نظر کے فوری منتہا کے پرلی طرف واقع ہیں، لیکن ایک زندہ جماعت کا سب سے زیادہ اہم جزو متصور ہونے کے قابل ہیں ۔۔۔۔۔ مجموعی حیثیت سے اگر نوع پر نظر ڈالی جائے تو اس کے وہ افراد جو ابھی پیدا نہیں ہوئے، اس کے موجودہ افراد کے مقابلے میں شاید زیادہ بدیہی الوجود ہیں ۔۔۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اقوام کے لیے سب سے مہتم بالشان عقدہ فقط یہ عقدہ ہے (خواہ اس کی حیثیت تمدنی قرار دی جائے، خواہ اقتصادی، خواہ سیاسی) کہ قومی ہستی کا سلسلہ بلا انقطاع کس طرح قائم رکھا جائے۔ کٹنے یا معدوم ہو جانے کے خیال سے قومیں بھی ویسے ہی خائف ہیں جیسے افراد![12]

علامہ کے بیان کردہ عمرانیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہمیں تاریخ کے اوراق اور صحف مقدسہ میں بے شمار ایسی قوموں اور ملتوں کا ذکر ملے گا جو اپنی اجتماعی خودی میں در آنے والی بیماریوں اور مفاسد کی اصلاح نہ کر سکیں اور منصۂ شہود سے ابدالآباد کے لیے معدوم ہو گئیں۔ قدیم بابلیوں، قبطیوں، سمیریوں اور یونانیوں وغیرہ کا وجود اب قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ تاہم ایسی اقوام بھی ہیں جو جابر و قاہر قوموں کی غلامی کا شکار ہوئیں اور صدیوں تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہیں۔ مگر اپنے تمام تر زوال و انحطاط کے باوجود اپنے وجود ملی کے تشخص کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہیں۔ ان میں ایک قوم بنی اسرائیل کی ہے جس نے پہلے مصر میں حکمرانی کی اور پھر چار سو سال تک فراعنہ کی بدترین غلامی کی۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام انھیں مصر سے نکال لائے ورنہ وہ بھی قبطیوں میں مدغم ہو کر قصۂ پارینہ بن جاتے۔ چینی قوم ایک طویل عرصے تک مختلف اخلاقی و روحانی امراض کا شکار ہو کر ذلت کی زندگی گذارتی رہی لیکن پھر صحت اور سلامتی کے راستے پر گامزن ہو گئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی مثال بھی عبرت انگیز ہے جنھوں نے ایک ہزار سال تک یہاں حکومت کی لیکن اپنے وجود ملی میں پلنے والی بیماریوں کا تدارک نہ کر سکے۔ جب اکبر نے دین الٰہی کے نفاذ کی صورت میں مسلمانوں کا تشخص ہی مٹا ڈالنے کی کوشش کی تو مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ نے شیخ احمد سرہندیؒ جیسی شخصیت پیدا کی جس نے مسلمانوں کے اجتماعی تشخص کی حفاظت کی۔ یہی کام شاہ ولی اللہؒ نے جاری رکھا۔ لیکن انگریزوں کی آمد کے بعد تو ہندوستانی مسلمانوں کا وجود پوری طرح سے خطرے میں پڑ گیا کیونکہ ہندوستانی مسلمان ہی انگریزوں کے اصل رقیب تھے اور انھیں مٹانے کی وہ ہر سطح پر کوششیں کر رہے تھے۔ ایسے میں مسلمانوں کے وجود ملی نے اپنی بقا اور دوام کے لیے ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا کیں جنھوں نے دشمن قوتوں کے ہر چیلنج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنے ناموس ملی کی حفاظت کی۔

(۳)

عمرانیات میں عموماً یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ فرد کو معاشرے پر اولیت اور تفوق حاصل ہے یا معاشرے کو فرد پر! مشہور فرانسیسی ماہر عمرانیات ایمائل ڈرخائم (Emile Durkheim) سوسائٹی کو ایک مستقل اکائی (Sui Generi) قرار دیتا ہے اور فرد کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ معاشرے کے فرد پر تفوق اور بالا دستی کی دلیل یہ دیتا ہے کہ معاشرتی اصول وضوابط اور قوانین افراد پر حکومت کرتے ہیں اور افراد ہر حال میں معاشرے کے زیر اثر رہتے ہیں۔ مذہب کی رو سے دیکھا جائے تو بظاہر فرد معاشرے پر تقدم رکھتا ہے کیونکہ معاشرہ فرد سے ہی وجود پذیر ہوتا ہے۔ کہا گیا کہ سب انسانوں کو نفسِ واحد سے پیدا کیا گیا۔[۱۳]

لیکن علامہ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو آنے والی تمام نسلِ انسانی نفس واحد کے اندر حیاتیاتی امکان کی صورت میں بالقوہ (Potentially) موجود تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ تخلیق کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا اور نسل انسانی بالفعل (Actually) وجود میں آ گئی۔ اس نقطۂ نظر سے اوّلیت اور تقدم کا سوال ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ نفس واحد کی تخلیق کے ساتھ ہی انسانی معاشرے کی تخلیق بھی ہوگئی تھی۔ بیج موجود ہو تو درخت بھی موجود ہوتا ہے اگرچہ ایک امکان کی صورت میں اس کے اندر بالقوہ مستور ہوتا ہے۔ رہا سوال تفوق اور اہمیت کا تو علامہ کا موقف اس بارے میں بڑا واضح ہے۔ وہ معاشرے اور سوسائٹی کو افراد پر اہمیت دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنے والی نسلیں منطقی امکان کے طور پر ہنگام آفرینش سے ہی نفس واحد میں مضمر تھیں اور نفس واحد کی ارتقائی حرکت کا تعین کر رہی تھیں۔ علامہ لکھتے ہیں:

> اگر (قوم) کی ماہیت پر نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ غیر محدود اور لامتناہی ہے۔ علم الحیات کے اکتشافاتِ جدیدہ نے اس حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا ہے کہ کامیاب حیوانی جماعتوں کا حال ہمیشہ استقبال کے تابع ہوتا ہے، مجموعی حیثیت سے اگر نوع پر نظر ڈالی جائے تو اس کے وہ افراد جو ابھی پیدا نہیں ہوئے زیادہ بدیہی الوجود ہیں، موجودہ افراد کی فوری اغراض ان غیر محدود و نامشہود افراد کی اغراض کے تابع بلکہ ان پر نثار کر دی جاتی ہیں جو نسلاً بعد نسل بتدریج ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔[۱۴]

ارسطو کہتا ہے کہ انسانی معاشرے کی خشتِ اوّل خاندان یا کنبہ کی اکائی ہے جو کہ خاوند، بیوی اور غلام پر مشتمل ہے۔ (ارسطو کے نزدیک ایک خاندان کے لیے غلام کا وجود بہت ضروری ہے)۔ ایک خاندان جب پھیلتا ہے تو کئی خاندان وجود میں آتے ہیں۔ متعدد خاندانوں سے ایک قبیلہ یا گاؤں بنتا ہے اور متعدد قصبات اور دیہات مل کر ایک شہری ریاست (City State) کی تشکیل کرتے ہیں۔ یوں انسانی معاشرے اور ریاست کی تشکیل ہوتی ہے۔

حیات نے تمام ذی روح مخلوقات کے اندر دو جبلتیں پیدا کیں جو انھیں شاہراہِ ارتقا پر سرگرم سفر رکھتی

ہیں۔ یہ جبلتیں ہیں تحفظِ ذات (Self-Preservation) اور اشاعتِ ذات (Self-Propagation) ۔ ہر زندہ فرد اپنے جیسے متعدد افراد کو معرضِ وجود میں لاتا ہے اور اپنے اور اپنی نسل کے تحفظ کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ان دو جبلتوں کے علاوہ ایک اور اہم جبلت مخلوقات میں پائی جاتی ہے اور وہ ہے غول پسندی (Gregariousness)۔ چیونٹیاں، شہد کی مکھیاں، تمام چرند پرند، حیوان اور انسان مل جل کر جھنڈ، جتھے یا جماعت کی صورت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔گروہی زندگی بسر کرنے کا رجحان نہ صرف حیوانوں میں بلکہ نباتی سطح پر بھی واضح طور پر نظر آتا ہے۔ جہاں گھاس کی ایک جڑ اگ آتی ہے وہاں رفتہ رفتہ اردگرد کی ساری زمین گھاس سے بھر جاتی ہے۔ جہاں ایک درخت اگتا ہے اس کے آس پاس کئی درخت اگنا شروع ہو جاتے ہیں۔

ماہرین عمرانیات غول پسندی کے جبلی رجحان کو انسان کی سماجی زندگی کی اساس قرار دیتے ہیں۔ شروع شروع میں گروہ کی صورت میں مل جل کر رہنا انسان کی مجبوری تھی۔ علامہ اس دور کا نقشہ بڑے خوبصورت انداز میں کھینچتے ہیں:

از چہ رو بر بستہ ربطِ مردم است رشتۂ ایں داستاں سردر گم است

(کچھ معلوم نہیں کہ انسانوں میں اوّل اوّل میل جول کیونکر پیدا ہوا۔اس کہانی کا ابتدائی رشتہ بالکل غائب ہے۔)

در جماعت فرد را بینم ما از چمن او را چو گُل چینم ما

(ہم فرد کو جماعت میں دیکھتے ہیں اور باغ سے اسے پھول کی طرح چن لیتے ہیں۔)

فطرتش وارفتۂ یکتائی است حفظِ او از انجمن آرائی است

(اس کی فطرت انفرادیت کی دلدادہ ہے۔لیکن اس کی حفاظت کا تقاضا یہ ہے کہ انجمن آراستہ کر کے زندگی بسر کرے۔یعنی بہت سے افراد مل جل کر گروہ کی صورت میں رہیں۔)

سوزدش در شاہراہِ زندگی آتشِ آوردگاہِ زندگی

(زندگی کے میدان جنگ کی آگ فرد کو شاہراہِ حیات میں جلا دیتی ہے۔یعنی زندگی بسر کرنے کے لیے انسان کو جو جدوجہد کرنی پڑتی ہے وہ اتنی مصیبت خیز ہوتی ہے کہ وہ تنہا اس سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ جماعت میں ہی یہ جدوجہد ممکن ہے۔)

مردماں خوگر بیک دیگر شوند سفتہ در یک رشتہ چوں گوہر شوند

(انسان اسی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور موتیوں کی طرح ایک رشتے میں پروئے گئے۔)

در نبردِ زندگی یار ہم اند مثل ہم کاراں گرفتار ہم اند

(وہ زندگی کی جنگ میں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ جس طرح ایک پیشے کے مختلف آدمی اکٹھے کام کرتے ہیں، اسی طرح یہ بھی اکٹھے ہو گئے۔)

منزل دیو و پری اندیشہ اش　　از گمانِ خود رمیدن پیشہ اش

(اس کے فکر و خیال پر دیو و پری اور بھوت پریت چھائے ہوئے تھے اور وہ اپنے ہی اوہام سے جو چیزیں تراشتا تھا، انھی سے ڈر کر بھاگتا تھا۔)

تنگ میدانِ ہستی خامش ہنوز　　فکرِ او زیرِ لبِ بامش ہنوز

(انسان کی زندگی ناپختہ تھی، اس کا میدان بہت تنگ تھا اور اس کی سوچ بچار نارسا تھی۔)

بیم جاں سرمایۂ آب و گلش　　ہم ز بادِ تند می لرزد دلش

(جان کا خوف انسان کی آب و گل کا سرمایہ تھا، یعنی اس کے اجزائے ترکیبی نے خوفِ جاں کے سوا کوئی چیز پیدا نہ کی تھی۔ تیز ہوا بھی چلتی تو اس کا دل لرز جاتا۔)

ہرچہ از خود می دمد بردارد ش　　ہرچہ از بالا فتد بردارد ش

(رموزِ بے خودی)

(جو کچھ زمین سے خود بخود اگ آتا یا اوپر سے گر پڑتا، اسی کو اٹھا کر گذارا کر لیتا یعنی کھیتی باڑی یا کسی دوسرے ذریعۂ معاش کا انتظام نہیں ہوا تھا، جہاں کوئی چیز مل جاتی وہ سبزی ہوتی یا کسی درخت یا جھاڑی کا پھل، اس پر انسان قانع تھا۔)

اس شعر میں حوالہ شکار کرنے اور اکٹھا کرنے والے معاشرے (Hunting and gathering society) کی طرف ہے جس میں مرد شکار وغیرہ کر کے لاتے اور عورتیں جنگل سے خود رو سبزیاں اور پھل وغیرہ اکٹھا کر کے لاتیں، لیکن رہتے سب مل جل کر تھے۔

علامہ کہتے ہیں کہ ہمیں معاشرے کے آغاز کا سراغ نہیں ملتا۔ اتنا پتا چلتا ہے کہ شروع شروع میں انسانی زندگی بڑی پسماندہ تھی اور ہر وقت اس پر اپنی جان کا خوف طاری رہتا تھا۔ وہ اپنے ہی اوہام میں گرفتار اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرتا تھا اور کھانے پینے کے لیے بھی جانوروں کی سطح سے بلند نہ ہوا تھا۔ ایسے میں صرف ایک ہی اصول تھا جو اس کی بقا کا ضامن تھا اور وہ یہ تھا کہ گروہ کے ساتھ چمٹا رہے۔ گروہ سے یہ وابستگی رفتہ رفتہ عصبیت کے ایک شعوری اور نفسیاتی رجحان میں بدل گئی جس کے ساتھ قبائلی زندگی کے سماجی، معاشی اور مذہبی خد و خال واضح ہونا شروع ہو گئے۔ قبائلی زندگی کے استحکام سے انسانی زندگی بہت بہتر ہو گئی۔ متعدد رسوم و رواج متشکل ہوئے اور ثقافت و تمدن کی داغ بیل پڑ گئی۔ عصبیت وہ ارتباطی اور قوت ناظمہ تھی جس سے قبیلے کا تشخص واضح ہوا اور طوطمیت (Totemism) کی صورت میں مذہبی اور دیگر

سماجی روایات کا آغاز ہوا۔ طوطم (Totem) کوئی جانور یا پرندہ ہوتا تھا جسے کوئی اپنی نشانی قرار دے کر اس کی پرستش کرتا تھا اور اس کے لیے کوئی معبد یا مندر وغیرہ تعمیر کرتا تھا۔ بھارت میں آج بھی ہنومان (بندر) گنیش (ہاتھی) اور ناگ (سانپ) کی پوجا کی جاتی ہے۔ ناگ پور کے نام سے تو ایک شہر بھی موجود ہے۔ طوطمیت سے قبائلی عصبیت کو بلند ترین سماجی اور مذہبی قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ عصبیت کی وجہ سے قبیلے میں استحکام، یکجہتی اور نظم پیدا ہوا تاہم اس کا منفی پہلو یہ تھا کہ دیگر قبائل سے نفرت کی جاتی تھی اور ان کے ساتھ تصادم اور پیکار کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ مفتوحہ قبیلے کے جنگجوؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ بعض قبائل عصبیت کی آنچ کو دھیما کر کے طاقت ور قبیلے کے ساتھ ''تحالف'' (Confideration) بھی کر لیتے یعنی ایک دوسرے کے ساتھ مختلف قسم کے معاہدے کر لیتے۔ رفتہ رفتہ مختلف قبائل نے مل کر ایک ریاست کی شکل اختیار کر لی اور ایک مخصوص خطۂ ارض اس ریاست کا وطن قرار پایا۔ ارضِ وطن کی محبت نے قبائلی عصبیت کی جگہ لے لی۔ قبائلی عصبیت یا حب وطنی کے معائب اور برے پہلو اپنی جگہ لیکن یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ سماجی تنظیم و ارتقا میں اس نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔

—— (۴) ——

اب تک جو تاریخی اور ارضیاتی شواہد دستیاب ہوئے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ انسان اس کرۂ ارض پر گذشتہ پانچ لاکھ سال سے آباد ہے۔[۱۵] انسان کا ابتدائی دور کیسے گذرا اس کے بارے میں تفصیلی شواہد میسر نہیں تاہم پچاس ہزار ق م میں شکار کرنے اور اکٹھا کرنے والا معاشرہ وجود میں آ چکا تھا جس میں مرد شکار کرتے اور عورتیں جنگل سے پکے ہوئے پھل وغیرہ اکٹھا کرتیں۔ ۱۲ ہزار قبل مسیح تک شکاری معاشرہ کھیتی باڑی کے اسرار و رموز اور مویشی پالنے کے طور طریقوں سے آگاہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ ۱۲۰۰۰ ق م سے چرواہوں اور کاشتکاروں کے معاشرے (Pastoral and Agrarian Society) کا آغاز ہوتا ہے۔ چرواہے عموماً خانہ بدوش ہوتے تھے اور اپنے ریوڑوں سمیت مختلف چراگاہوں کی طرف نقل مکانی کرتے رہتے تھے۔ ان کے برعکس کاشتکاروں نے مخصوص قطعات اراضی پر کھیتی باڑی شروع کی جس سے سکونت پذیر معاشرے اور دیہات وغیرہ وجود میں آئے۔ ۶۰۰۰ ق م میں فنِ تحریر ایجاد ہوا جس سے بکھرے ہوئے دیہات اور قبائل شہری ریاستوں اور مملکتوں میں منظّم ہونا شروع ہو گئے کیونکہ لکھنے کے فن کی ترویج سے ریاستوں اور مملکتوں کے انتظام و انصرام میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے ماہرین عمرانیات کے نزدیک فنِ تحریر (Art of writing) کی ایجاد سے ہی تمدن (Civilization) کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سارے ارتقائی عمل میں عصبیت اور خطۂ ارض سے محبت ایک ارتباطی معاشرتی اصول کی حیثیت سے کارفرما رہی۔

لیکن جب طاقتور حکمرانوں نے اردگرد کے کمزور علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کرنا شروع کیا تو سماجی یگانگت کا یہ اصول بھی کمزور پڑنا شروع ہو گیا۔ تجارت اور جنگ دو ایسے ذرائع ہیں جن سے تہذیبوں اور ثقافتوں کا باہمی اختلاط اور امتزاج ہوتا ہے۔ تاجر جب دور دراز کے علاقوں میں اپنا مال فروخت کرنے جاتے ہیں تو نئے طرزِ زندگی، نئی معاشرت اور نئے رسم و رواج سے آشنا ہوتے ہیں اور اپنے وطن واپس آ کر انھیں اپنے لوگوں میں متعارف کرواتے ہیں۔ اسی طرح فاتح عساکر کے جلو میں ثقافتی اور تہذیبی عوامل بھی سفر کرتے ہیں اور نئی سرزمین پر جا کر جڑیں پکڑ لیتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ فاتح عساکر مفتوحہ علاقوں کی ''ثقافتی چھوت'' سے نہ بچ سکے اور وہ فاتح ہوتے ہوئے بھی مفتوحین سے متاثر ہوئے۔ شہنشاہوں کی سلطنتوں کی حدود جب وسعت پذیر ہوئیں اور متعدد کمزور علاقے ان کے زیرِ نگیں آ گئے تو ''علاقے سے پیوستگی'' (Ethnocentrism) کے رجحان میں بھی ضعف پیدا ہو گیا۔ اب حب وطنی اور قبائلی عصبیت سماجی ہم آہنگی اور معاشرتی یگانگت کا مؤثر اصول نہ رہی۔ چنانچہ ایک اور اصول وضع کیا گیا۔ یہ تاج و تخت سے وفاداری اور شاہوں کے الوہی حق (Divine Right of King) کا اصول تھا۔ یہ اصول کچھ دیر تک کام کرتا رہا مگر جب شہنشاہوں نے جغرافیائی اور ثقافتی طور پر مختلف اور متفرق اور متعدد علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کر کے بڑی بڑی عظیم الشان سلطنتیں (Empires) قائم کیں تو سماجی وحدت و یگانگت کا یہ اصول بھی ناکارہ ہو گیا۔ ایک بڑی ایمپائر میں جب کئی ثقافتوں، رنگوں، نسلوں اور زبانوں پر مشتمل علاقے شامل ہوتے تھے تو ان کا مؤثر انتظام و انصرام کرنا بڑا مشکل ہو جاتا۔ مزید برآں انھیں محض تخت و تاج سے وفاداری کے تصور کے تحت متحد رکھنا بھی ممکن نہ تھا۔

علامہ اقبال نے شہنشاہ جولین کی مثال دی ہے جو اپنی ایمپائر کے سیاسی و سماجی اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے کسی اصول کی تلاش میں مسیحیت کی طرف راغب ہوا، لیکن جلد ہی مسیحیت کی راہبانہ تعلیمات سے دل برداشتہ ہو کر قدیم رومی دیوتاؤں کی طرف لوٹ گیا۔[۱۶]

اس صورتِ حال کی توضیح و تشریح کے لیے علامہ نے مشہور مؤرخ ڈینی سن (Denison) کی کتاب *Emotion as the Basis of Civilization* سے ایک اقتباس دیا ہے جو درج ذیل ہے:

> It seemed then that the great civilization that it had taken four thousand years to construct was on the verge of disintegration, and that mankind was likely to return to that condition of barbarism where every tribe and sect was against the next, and law and order were unknown . . . The old tribal sanctions had lost their power. Hence the old imperial methods would no longer operate. The new sanctions created by Christianity were working division and destruction instead of unity and order. It was a time fraught with tragedy. Civilization, like a gigantic tree whose foliage had overarched the world and whose branches had borne the golden fruits of art and science and literature, stood tottering, its trunk no longer alive with the

flowing sap of devotion and reverence, but rotted to the core, riven by the storms of war, and held together only by the cords of ancient customs and laws, that might snap at any moment. Was there any emotional culture that could be brought in, to gather mankind once more into unity and to save civilization? This culture must be something of a new type, for the old sanctions and ceremonials were dead, and to build up others of the same kind would be the work of centuries. [17]

ڈینی سن نے بڑی وضاحت اور صدق دل سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عین اس وقت جب انسانی تمدن تباہی کے کنارے پہنچ چکا تھا، اسلام کا ظہور ہوا اور اس کی روحانی تعلیمات نے دنیا کو سماجی تنظیم کا ایک نیا آئیڈیل عطا کیا۔

یہ نیا آئیڈیل عقیدۂ توحید تھا۔ اسلام نے انسانوں کی وفاداری کو رنگ و نسل اور قبیلہ و وطن سے ہٹا کر ایک ان دیکھے خدا کے ساتھ مشروط کر دیا۔ خدا کی وحدانیت پر ایمان لاتے ہی بہت سے عقائد اور ذہنی رویوں کا از خود ابطال ہو جاتا ہے۔ انسان سب سے پہلے ہر قسم کی الوہیت سے انکار کرتا ہے۔ نہ وہ اصنام و اوثان کو خدا مانتا ہے نہ قبیلے، وطن یا نسل کو الوہیت کے رنگ میں رنگتا ہے۔ پھر وہ ایک خدا کو تسلیم کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ یہ عقیدۂ توحید انسانیت کو اللہ کی طرف سے عطا ہوا اور اس کا بیج ایک صاحب دل (نبی) نے دلوں کے اندر بویا ہے:

تا خدا صاحب دلے پیدا کند
کو ز حرفے دفترے املا کند

اور

نکتۂ توحید باز آزمودش
رسم و آئینِ نیاز آموزدش

(رموز بے خودی)

(نبی ان کے دل میں نکتۂ توحید بٹھاتا ہے اور خدا کے سامنے جھکنے، اس کی عبادت کرنے اور اس کے احکام کی تعمیل کا طریقہ سکھاتا ہے۔)

علامہ کے نزدیک عقیدۂ توحید فرد کی انفرادی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب لاتا ہے کہ اس سے ایک بالکل مختلف اور نئی شخصیت پیدا ہوتی ہے:

نوعِ دیگر آفریند بندہ را

نظریۂ توحید کو وہ روح قرار دیا جا سکتا ہے جس کے گرد امتِ مسلمہ کا پیکر تیار ہوتا ہے اور اس روح کو رسول اپنی رسالت کے ذریعے لوگوں کے اندر پھونکتا ہے۔ ملت کا وجود رسول کے دم سے ہوتا ہے، اگر رسول نہ ہو تو ملت بھی نہیں ہو سکتی۔

علامہ کے نزدیک نظریۂ توحید سے وابستہ ہونے والے افراد مل کر ایک ایسی جماعت تشکیل دیتے ہیں جو رنگ، نسل، زبان یا وطن کے اشتراک کے باعث وجود میں نہیں آتی بلکہ ایک خالص روحانی نظریہ کے اشتراک کی وجہ سے ابھرتی ہے اور جس میں کسی بھی خطے کا، کوئی بھی زبان بولنے والا اور کسی بھی رنگ و نسل کا انسان شامل ہوسکتا ہے۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

> ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ وطن، نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی، بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالتمآب نے قائم فرمائی تھی، اس لیے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادّی قیود سے بے زاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعتِ اشخاص ہے جس میں بڑھتے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔[۱۸]

علامہ کے نزدیک سماجی تنظیم اور تمدنی ارتقا کا یہ نیا آئیڈیل عین اس وقت انسانیت کو عطا ہوا جب کہ تمام گذشتہ Sanctions فرسودہ ہو چکی تھیں اور پارہ پارہ ہوتے ہوئے انسانی تمدن کو حیاتِ نو کی اشد ضرورت تھی۔ قبائلی عصبیت، لسانی اور وطنی وابستگی، تخت و تاج سے وفاداری جیسے اصول اب انسانی گروہوں اور جمعیتوں کو متحد رکھنے کے لیے غیر مؤثر ہو چکے تھے۔ اب یہ ضروری ہو چکا تھا کہ ایک خطے کی ثقافت اور علم و فن کا امتزاج اور تعامل دوسرے خطے کی ثقافت اور علم و فن سے بھی ہو، تاکہ سماجی رشتے اور انسانی روابط مستحکم ہوسکیں۔ عرب کے لوگ اپنی طبیعت کے لحاظ سے سادہ اور طرزِ بود و باش میں فطرت کے قریب تر تھے۔ اسی لیے پیغامِ توحید نے بڑی جلدی ان کے ذہنوں کو مسخر کر لیا اور وہ اس روحانی پیغام کے بندھن میں بندھ گئے۔ اب ان کی گروہ بندی یا انجمن آرائی رنگ و نسل یا وطن و قوم کے اشتراک کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ نظریۂ توحید سے وابستگی کی وجہ سے تھی۔ مختلف رنگوں، زبانوں، نسلوں، وطنوں اور قوموں کے افراد و اشخاص گویا ایک پارٹی کے منشور پر اکٹھے ہو گئے اور امتِ مسلمہ کہلائے۔[۱۹] اس امت کے لیے تمام کرۂ ارض مسجد قرار پایا اور پیغامِ توحید کو دنیا کے چپے چپے پر پھیلانا فرض! عربوں نے اسلام کی اشاعت اور اسلامی تعلیمات کی تبلیغ میں شاندار خدمات انجام دیں۔ لیکن علامہ کے نزدیک اسلامی علوم و فنون بالخصوص اسلامی فلسفہ و حکمت کے فروغ کے سلسلے میں دیگر اقوام نے ہی اپنا مخصوص کردار ادا کیا۔ بالخصوص فتح ایران سے اسلامی تہذیب و ثقافت میں نہایت دلآویز رنگ شامل ہو گئے اور اس میں حد درجہ گہرائی پیدا ہو گئی۔[۲۰]

علامہ فرماتے ہیں کہ اسلام نے انسانیت کو ایک ایسا ارفع و اعلیٰ آئیڈیل فراہم کیا ہے جس کی بدولت تمام انسانیت متحد اور منظّم ہوسکتی ہے۔ توحید یہ آئیڈیل ہے اور اس سے وابستگی انسانوں کو لسانی، نسلی اور علاقائی حد بندیوں سے نجات دلا کر ارتقا کی اگلی منزلوں کی طرف لے جاتی ہے۔ اسلامی تعلیمات کا مقصد نہ

صرف افراد و اشخاص کی انفرادی اصلاح ہے بلکہ ایک ایسے سماجی نظام کی تشکیل بھی ہے جس میں تمام انسان متحد و مربوط ہو سکیں۔ توحید کو اپنانے کی تلقین کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگ رنگ و نسل اور وطن و قوم جیسے بتوں سے جان چھڑا کر ایک مجرد اور روحانی اصول سے وابستہ ہو جائیں تا کہ وحدتِ بشری کا نصب العین حاصل ہو سکے اور ایک عالمی روحانی جمہوریت کا قیام عمل میں آ سکے جس میں تمام انسان امن و سکون اور باہمی اشتراک و تعاون سے زندگی بسر کر سکیں اور اللہ کی ان نعمتوں سے متمتع ہو سکیں جو اس نے ان کے لیے پیدا کر رکھی ہیں۔ علامہ نے اس کا ذکر اسرار خودی کے اس اجمالی خاکے میں کیا ہے جو انھوں نے ڈاکٹر نکلسن کی فرمایش پر خود تحریر کیا تھا:

تربیت خودی کے تین مراحل ہیں (۱) دستور الٰہی کی اطاعت (۲) ضبطِ نفس — اور (۳) نیابت الٰہی۔
نیابت الٰہی دنیا میں انسانی ارتقا کی آخری منزل ہے۔ جو شخص اس منزل پر پہنچ جاتا ہے وہ اس دنیا میں خلیفۃ اللہ ہو جاتا ہے۔ وہ کامل خودی کا مالک اور انسانیت کا منتہاے مقصود ہوتا ہے۔ روح اور جسم دونوں کے لحاظ سے حیات کا بلند ترین مظہر ہوتا ہے۔ یعنی اس کی زندگی میں آ کر حیات اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ کائنات کے پیچیدہ مسائل اس کی نظر میں سہل معلوم ہوتے ہیں اور اعلیٰ ترین قوت اور برترین علم دونوں کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی زندگی میں فکر اور عمل، جبلّت اور ادراک ایک ہو جاتے ہیں۔
چونکہ وہ سب سے آخر میں ظاہر ہوگا۔ اس لیے وہ تمام صعوبتیں جو انسانیت کو ارتقاے منازل طے کرنے میں لاحق ہوتی ہیں، برمحل ہیں۔ اس کے ظہور کی پہلی شرط یہ ہے کہ بنی نوع آدم جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے ترقی یافتہ ہو جائیں۔ فی الحال اس کا وجود خارج میں موجود نہیں۔ لیکن انسانیت کی تدریجی ترقی اس امر کی دلیل ہے کہ زمانہ آیندہ میں افراد کاملہ کی ایسی نسل پیدا ہو جائے گی جو حقیقی معنوں میں نیابت الٰہی کی اہل ہوگی۔
زمین پر خدا کی بادشاہت کے یہ معنی ہیں کہ یہاں یکتا افراد کی جماعت جمہوری رنگ میں قائم ہو جائے۔ ان کا صدرِ اعلیٰ وہ شخص ہوگا جو ان سب پر فائق ہوگا اور اس کا نظیر دنیا میں نہیں مل سکے گا۔
نیٹشے نے بھی اپنے تخیل میں افرادِ یکتا کی ایسی جماعت کی ایک ایسی ہی جھلک دیکھی تھی لیکن اس کے نسلی تعصب نے اس تصویر کو بھونڈا کر دیا تھا۔[۲۱]

—— (۵) ——

کرۂ ارض پر انسان کی آمد اور انسانی معاشرے کے ارتقا پذیر ہونے کے بارے میں متعدد نظریات پائے جاتے ہیں۔ کوئی نظریہ اس بات کا پرچار کرتا ہے کہ انسان نچلے درجے کے حیوانات سے ارتقا پذیر ہو کر موجودہ سطح تک پہنچا ہے اور انسانی معاشرے پر بھی انھی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے جن کے تحت حیوانات کا ارتقائی عمل جاری ہے۔ اس نظریہ کے حامی ڈارون، لامارک اور اسپنسر وغیرہ ہیں جو انسانی معاشرے کے ارتقا

میں قانون بقائے اصلح (Survival of the Fittest) اور ماحول سے مطابقت (Adaptation to the Environment) کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ہنری برگساں کے نزدیک جوششِ حیات (Elan Vital) ارتقا کی نت نئی شکلیں پیش کرنے کا ایک ایسا رجحان ہے جو تخلیقی عمل میں مسلسل پیچیدہ اور خطرناک راستے اختیار کر رہا ہے۔

قرآن کریم کی رو سے آدم کی تخلیق اللہ کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ اللہ نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ ملائکہ جو کہ پہلے سے ہی احکام الٰہی کی بجا آوری میں مصروف تھے اور ہر لمحہ اللہ کی تحمید و تقدیس میں منہمک رہتے تھے حیران ہوئے کہ اس مخلوق کو پیدا کرنے کیا ضرورت تھی جو زمین پر دنگا فساد اور کشت وخون کا باعث بننے والی تھی۔ ملائکہ کا یہ سوال کوئی سرکش یا تمرد نہ تھا بلکہ صرف استعجاب تھا جس کے جواب میں اللہ نے فرمایا جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ پھر اللہ نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھائے، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا ''کہ اگر تمھارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے مقرر کرنے سے دنگا و فساد اور کشت وخون کا بازار گرم ہوگا اور نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ۔'' ملائکہ نے عرض کیا ''نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے۔ ہم کو تو اتنا ہی علم حاصل ہے جتنا آپ نے عطا کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ ہی سب کچھ جاننے والے اور حکمت والے ہیں۔'' اللہ نے فرمایا ''اے آدم! تم انھیں ان اشیاء کے نام بتاؤ۔'' جب اس نے ان کو ان سب چیزوں کے نام بتا دیے تو اللہ نے فرمایا کہ میں ہی آسمانوں اور زمین کے چھپے ہوئے بھید جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو وہ بھی جانتا ہوں۔'' پھر اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ سب فرشتوں نے سجدہ کیا۔ مگر ابلیس نے انکار کر دیا اور اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔ پھر اللہ نے آدم اور اس کی بیوی کو جنت میں رہنے اور حسب منشا کھانے پینے کی اجازت دے دی۔ تاہم اللہ نے آدم و حوا کو ایک مخصوص درخت کے قریب جانے سے منع کر دیا۔ مگر شیطان نے انھیں بہکایا اور انھیں اللہ کے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا۔ اس حکم عدولی کی پاداش میں اللہ نے ان سب کو جنت سے نکال دیا اور انھیں ایک دوسرے کا دشمن (یعنی شیطان کا دشمن انسان اور انسان کا دشمن شیطان) بنا دیا۔ بعد ازاں آدم نے استغفار کی اور اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔[۲۲] زمین پر اتارا جانا بطور سزا نہ تھا۔ بلکہ زمین پر انھیں اپنا خلیفہ بنانا شروع سے ہی مشیت الٰہیہ میں شامل تھا ورنہ معافی کے بعد انھیں جنت میں ہی رہنے دیا جاتا۔ انسان اور شیطان دونوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا کر زمین پر اتار دینے کی کیا مصلحت تھی؟ یہ صرف اللہ کو ہی معلوم تھا۔

قرآن میں تخلیق آدم کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے وہ ''عہد نامۂ عتیق'' (Old Testament) کے بیان

کردہ قصے سے قدرے مختلف ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم میں قصوں کا تذکرہ کسی تاریخی صورت حال کو اجاگر کرنے کے لیے نہیں بلکہ کسی عالمگیر اخلاقی سبق کی وضاحت کے لیے کیا جاتا ہے۔ علامہ کے نزدیک آدم اور حوا کا باغِ عدن یہ دنیا بھی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ قرآن نے زمین کو انسان کی آرام گاہ بتایا ہے جہاں اللہ نے اسے بااختیار بنا کر بسایا ہے۔ اس قصے میں بیان کردہ جنت سے مراد حیاتِ انسانی کا وہ دَور لی جاسکتی ہے جس میں وہ ابھی اپنے ماحول سے پوری طرح شناسا نہ ہوا تھا اور اسے اپنی کمزوری ومحتاجی کا بھی شعور نہ تھا۔ علامہ کے خیال میں آدم کا شیطان کے بہکاوے میں آنا اور شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانا وہ پہلا اختیاری عمل تھا جو اس نے اپنی مرضی اور اختیار سے کیا اور اسی وجہ سے یہ معاف بھی کر دیا گیا۔

ملائکہ کو اللہ کی طرف سے جو علم عطا کیا گیا تھا وہ محدود تھا اور ان کے کارہائے مفوضہ تک ہی محدود تھا مزید برآں ملائکہ آزادی اور اختیار بھی نہ رکھتے تھے۔

اس کے برعکس آدم کو جو علم عطا کیا گیا اس میں وسعت اور جامعیت تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اسے آزادی اور اختیار بھی ملا تھا۔ اس طرح بنی نوع آدم نے علم اور اختیار کے ساتھ اس کرۂ ارض پر اپنے ارتقا کا آغاز کیا اور تہذیب وثقافت کی داغ بیل ڈالی۔

کرۂ ارض پر ہمیشہ سے اتنے وسائل اور اللہ کی نعمتیں موجود رہی ہیں کہ اولادِ آدم نہایت آرام وسکون سے یہاں زندگی بسر کرسکتی تھی۔ لیکن پوری تاریخ انسانی کشت وخون، دنگا فساد اور ظلم و جور کی لرزہ خیز داستانوں سے بھری ہوئی ہے۔ فرشتوں کا استعجاب و استفسار غلط نہ تھا۔ ان کی توقعات کے عین مطابق انسان نے یہاں فساد بپا کیا اور خونریزی کی۔ ابلیس انسان کا ازلی دشمن ہے۔ اس نے آدم کو جنت میں بہکایا اور زمین پر بھی اسے گمراہ کیا۔ اس نے شروع سے ہی انسان میں زیادہ سے زیادہ کی ہوس، کمزوروں کا استحصال، فتنہ وفساد اور جنگ وجدل کے شعلے بھڑکائے۔ اس کی خباثت کے ساتھ ذہانت بھی ملی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے ذہین وفطین انسانوں کے ذریعے سے ایسے فلسفوں اور مسلکوں کو ایجاد کیا کہ بھائی بھائی کا گلا کاٹنے لگا اور طاقتور کمزور کو کچلنے لگا۔ ملوکیت، اشتراکیت، فسطائیت، حتیٰ کہ جمہوریت بھی اس کے پیدا کردہ فتنے ہیں جن سے امن کی بجائے فساد پیدا ہوتا آیا ہے۔ انھی فتنوں میں سے ایک فتنہ وطنیت بھی ہے۔ وطن سے محبت، اس کی ترقی اور حفاظت نہایت مستحسن جذبہ ہے۔ لیکن جب وطن معبود کا درجہ اختیار کر لیتا ہے اور حب الوطنی پرستش کی حدوں کو چھونے لگتی ہے تو یہ ابلیسی مقاصد کو پورا کرنے لگتی ہے۔ کیونکہ ایک قوم اپنی برتری کے گھمنڈ اور تعصب میں اندھی ہوجاتی ہے اور دوسری اقوام کو تباہ و برباد کر دینے پر تل جاتی ہے۔

نسلی برتری اور قومی تعصب کا سبق تاریخ کے ہر دور میں ابلیس اپنے پیروکاروں کو پڑھاتا آیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہمیشہ سے ہی انسانی گروہوں کے مابین دنگا فساد اور قتال وجدال کا بازار گرم رہا۔ لاتعداد

مرد و عورتیں اور بچے ناحق قتل ہوتے رہے اور بچ جانے والے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے جاتے رہے۔ مظلوم انسانوں کی ہڈیوں پر عالیشان قصر تعمیر ہوتے رہے جن میں ظالم فاتحین عیش و عشرت کی ہر حد کو پھلانگتے رہے۔ بقول ڈینی سن انسانی تہذیب و تمدن کا وقیع الشان درخت اندر سے مکمل طور پر دیمک خوردہ ہو چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ انسانیت ابلیسی انتقام کا نشانہ بن کر ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جاتی کہ اسلام کا ظہور ہوا اور دم توڑتے شرفِ انسانیت میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ طاغوتی قوتیں انگشت بدنداں رہ گئیں اور ملائکہ کے اندیشے غلط ثابت ہو گئے۔

حضرت محمد نے جزیرۃ العرب میں ایک ایسی ریاست قائم کی جس کی بنیاد ایک روحانی اصول یعنی کلمۂ توحید تھا۔ مختلف رنگوں، نسلوں، علاقوں اور زبانوں کے لوگ اس عالمگیر برادری اور روحانی اخوت کا حصہ تھے جسے نیابت الٰہیہ کا شرف حاصل ہوا۔ چونکہ اسلامی ریاست میں تخلیقِ آدم کا اصل مقصد (استخلاف فی الارض) پورا ہوا اس لیے اس کا نام بھی 'خلافت' رکھا گیا۔ حضورؐ کی حیات طیبہ میں اسلامی ریاست کا نظام براہِ راست آپؐ کے زیرِ نگرانی رہا جس کی تین اہم جہتیں تھیں: دفاعی و فوجی جہت، انتظامی و شرعی جہت اور روحانی و تبلیغی جہت۔ آپؐ کی وفات کے بعد نیابت الٰہیہ کا منصب خلفاے راشدین کی طرف منتقل ہو گیا۔ یہ ایسے حکمران تھے جو حضورؐ کے خلیفہ یا جانشین تھے، اس لیے ان کا دورِ حکومت ''خلافۃ علیٰ منہاج النبوۃ'' کہلایا اور اس میں حکمرانی کی تینوں مذکورہ جہتیں برقرار رہیں۔[۲۳] یعنی حکمران مسلمانوں کے دفاعی معاملات اور فوجی مہمات کا سربراہ بھی ہوتا تھا، داخلی انتظامی معاملات اور عدالتی و شرعی امور کا نگران بھی ہوتا تھا اور دین کی تبلیغی اور روحانی سرگرمیوں کی حفاظت و نگہداشت بھی اس کے ذمہ ہوتی تھی۔

خلافتِ راشدہ کے زمانے میں اسلامی مملکت کا دائرہ بڑا وسیع ہو گیا تھا۔ خلافتِ راشدہ کے بعد اموی اور عباسی خلفاء آئے۔ حکمرانی کی تینوں جہتیں جدا جدا ہو گئیں۔ حکمرانی مطلق العنان ملوکیت کا رنگ اختیار کر گئی۔ مال و دولت کی فراوانی نے حکمرانوں کو عیش پرست بنا دیا۔ صالح اور اللہ سے ڈرنے والے لوگ بتدریج حصول اقتدار کی سازشوں اور منافقتوں سے پہلو بچا کر گوشہ نشین ہو گئے۔ زمام حکومت فاسق فاجر افراد کے ہاتھ میں چلی گئی۔ علامہ نے زوال امت کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی گنوایا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد اعلیٰ فکری صلاحیتوں کے حامل اور شفاف سیرت و کردار رکھنے والے لوگ بتدریج دنیاوی امور اور کاروبار جہانبانی سے الگ ہو کر تصوف کی طرف مائل ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی قیادت عام (اور بعض حالات میں کم ظرف اور بدکار) لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔[۲۴] خلافت صرف سیاست رہ گئی اور اس کی روحانی جہت کا خاتمہ ہو گیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ انتظامی امور بھی نائبین اور وزراء نے سنبھال لیے اور خلفاء کا کام قصر خلافت میں دادِ عیش دینا رہ گیا۔ اموی اور عباسی خلفاء میں بعض ایسے بھی آئے جنھوں نے خلافت راشدہ کے ماڈل کو اپنانے کی حتیٰ المقدور کوشش کی۔ تاہم ان میں ایسے بھی تھے۔ جنھوں نے برملا قرآن و سنت سے

اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ اسلام کی ابتدائی چند صدیوں میں اردگرد کے متعدد ممالک خلافت اسلامیہ کے زیرنگیں آ گئے۔ سندھ کے علاوہ اسلامی سلطنت کی حدود اندلس اور مغرب اقصیٰ سے لے کر بلخ، سمرقند اور فرغانہ تک پھیل چکی تھیں۔ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں وسط ایشیا کے بے شمار قبائل اور بڑی بڑی آبادیاں بغیر فوجی دباؤ کے از خود اسلام قبول کرنے لگی تھیں۔ افغانستان اور ترکستان کے ترک خانوں اور سرداروں کو خلافتِ اسلامیہ میں خوش دلی سے قبول کیا گیا۔ پھر انھی ترکوں کی اولاد نے ہندوستان میں وسیع اسلامی مملکت قائم کی جس کی سرحدیں بنگال بلکہ برما کے اضلاع تک اور جنوب میں ہندوستان کے آخری گوشے راس کماری تک پہنچ گئیں۔ امویوں کے دور تک خلافتِ اسلامیہ کا انتظام ایک ہی مرکز کے تحت ہوتا تھا۔ عباسیوں کے دور میں دور دراز کے صوبوں اور ولایتوں میں وراثتی حاکم مقرر کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی جس سے مرکز کمزور ہوتا گیا اور مختلف ولایتوں میں حصول اقتدار کی رسہ کشی شروع ہوگئی۔ تاہم کوئی صوبہ یا ولایت اپنے طور پر خودمختار بننے کے بعد بھی خلافتِ اسلامیہ سے تعلق توڑتی نہیں تھی۔ ان میں سے بعض تو باقاعدہ دربارِ خلافت کی باجگزار تھیں۔ علامتی طور پر ہی سہی، دربار خلافت سے اپنے لیے سند یا منظوری حاصل کرتی تھیں۔ عباسیوں کے بعد خلافت ترکوں کے ہاتھ میں آ گئی اور وہ تبرکات نبویؐ جن کا خلیفۃ المسلمین محافظ اور امین متصور ہوتا تھا، استنبول منتقل کر دیے گئے۔ اس طرح مسلمان شروع سے لے کر خلافت عثمانیہ کے اختتام تک تقریباً تیرہ سو سال تک خلافت کے نظام کے تحت زندگی بسر کرتے رہے۔ اگرچہ خلافت اسلامیہ کے مختلف ادوار میں خانہ جنگیوں، سازشوں، فتنوں اور قتال و جدال کا بازار گرم رہا، تاہم مجموعی طور پر مسلمانوں کی عزت و ناموس محفوظ رہا اور وہ اپنے شعائر دینی کے مطابق زندگی بسر کرتے رہے۔ حتیٰ کہ تاتاریوں کی یلغار، سقوط بغداد اور زوال اندلس جیسے عظیم سانحے بھی وقتی بحران پیدا کر کے ختم ہو گئے، صلیبی جنگوں کے دھچکے بھی مملکتِ اسلامیہ میں دراڑیں نہ ڈال سکے۔ اگر بعض مسلمان حکمران نااہل اور ناعاقبت اندیش تھے جنھوں نے خلافت کے روحانی اور تبلیغی فرائض کی طرف سے آنکھیں بند کیے رکھیں تو دوسری طرف ہر دور میں علماء، فقہاء، صالحین اور صوفیہ کی جماعتیں موجود اور فعال رہیں جن کی مساعی سے اسلام کی تعلیمات کی ضو پاشی میں اضافہ ہوتا رہا اور روحانی و اخلاقی فیوض و برکات کا سلسلہ جاری رہا۔

اس طرح ایک عالمی ریاست، وحدتِ بشری اور عالمگیر انسانی اخوت کا وہ تصور کبھی بھی نہ دھندلایا جو آدم کی تخلیق کے وقت منشائے الٰہی تھا اور جسے ''استخلاف فی الارض'' سے موسوم کیا گیا تھا۔

ابتدا میں ہم دیکھ آئے ہیں کہ علامہ کے فلسفۂ خودی اور بے خودی کا یہی مرکزی نقطہ ہے۔ وہ انفرادی خودی کی تعمیر اور اس کے استحکام پر زور دیتے ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ زور وہ افراد کے وجودِ ملی میں مدغم ہونے پر دیتے ہیں۔ وہ ایک ایسی عالمی ریاست کا خواب دیکھتے ہیں جس کے تمام افراد کامل و یکتا

ہوں اور وہ سب ایک روحانی جمہوری نظام میں رہ رہے ہوں۔ ان کا وطن زمین کا ایک خطہ نہ ہو بلکہ پورا کرۂ ارض ان کا وطن ہو۔

—— (۶) ——

انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقا کی داستان نامکمل رہے گی اگر اُس کردار کا ذکر نہ کیا جائے جس کے لہو نے بقول علامہ ''قصۂ آدم کو رنگین کر دیا۔'' مشیت الٰہیہ سے سرکشی کرنے والا یہ کردار ابلیس کا ہے جو خود کو آدم اور ملائکہ سے برتر سمجھتا تھا۔ اس نے خدا کے فیصلے کو غلط ثابت کرنے اور انسانوں کو بہکانے کے لیے مہلت اور اختیار طلب کیا جو کہ اسے دے دیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابلیس آسمانی مخلوقات میں سب سے زیادہ ذہین اور چالاک تھا۔ آدم کے ساتھ اسے بھی باغِ عدن سے نکال دیا گیا۔ اپنی ذہانت اور چالاکی سے وہ آسمانی مخلوقات کی ایک کثیر تعداد کو بہکا کر اپنے ساتھ زمین پر لے آیا جسے ہم ذریت ابلیس کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ابلیس کا خیال تھا کہ کائنات کے نظام کو چلانے کا جو منصوبہ اللہ تعالیٰ نے بنایا تھا وہ قابل عمل نہ تھا۔ اس کا یہ نقطۂ نظر اس مفروضے پر قائم تھا کہ اگر کسی مخلوق کو اختیار اور طاقت سے نواز دیا جائے تو وہ اللہ کی طرف راغب نہیں ہوگی۔ یہ ممکن نہیں کہ انسان محض خدا کی عظمت وجلالت کے پیشِ نظر اور اس سے محبت وعقیدت کے جذبے کے تحت اس کی اطاعت کرے۔ ابلیس کی آئیڈیالوجی یہ تھی کہ صرف طاقت ہی حق وصداقت ہے اور کمزوروں پر طاقتور ہی حکمرانی کا استحقاق رکھتے ہیں۔ اپنے اسی دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے اس نے زمین پر بنی نوع انسان کو بہکانے اور گمراہ کرنے کا مشن شروع کیا۔

ابلیس اور اس کے چیلوں نے پہلے دن سے اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرنے شروع کر دیے تھے۔ بھائی کو بھائی سے مروا دیا۔ اولاد کو باپ سے باغی کر دیا۔ انسانی گروہوں کے درمیان معمولی تنازعات پر کشت وخون کا بازار گرم کروایا۔ اشرف المخلوقات کو جمادِ لایعقل کے آگے سجدہ ریز کروایا اور اصنام واوثان کی پرستش کے لیے باقاعدہ مندر اور بت کدے تعمیر کروائے۔ الغرض شیطانی قوتوں نے انسانوں کو اللہ کے راستے سے ہٹانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن انبیاء علیہم السلام مسلسل فریضۂ رشد وہدایت سرانجام دیتے رہے اور حق کی روشنی طاغوتی ظلمتوں میں بہت زیادہ نہ سہی، لیکن برقرار ضرور رہی تا آنکہ حضرت محمدؐ کی حیاتِ مبارکہ میں استخلاف فی الارض کا منشاے الٰہی عملاً پورا ہو گیا اور ابلیس کا مفروضہ کہ خالصتۂ رضائے الٰہی کے لیے اللہ کی اطاعت ممکن نہیں، غلط ثابت ہو گیا۔

ابلیس کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہ ہر دور کے ذہین ترین انسانوں کا انتخاب کرتا اور ان پر اپنا سحر پھونک کر ان کے جسم وجاں پر قابض ہو جاتا اور انھی کے ذریعے سے وہ اپنے ناپاک منصوبوں کو عملی جامہ پہناتا۔ ایسے

خفیہ معبد اور لاجز ہمیشہ موجود رہتے ہیں جنھیں شیطانی منصوبہ بندیوں اور سازشوں کے مراکز کہا جا سکتا ہے۔ کچھ ایسی قدیم اور خفیہ دستاویزات ''پروٹوکولز'' کے نام سے دستیاب ہوئی ہیں جن سے شیطان کی اس بین الاقوامی سازش کا سراغ ملا ہے جس کا مقصد ساری دنیا کی حکومتوں اور مذاہب کی تباہی اور ایک عالمی شیطانی حکومت کا قیام ہے۔[۲۵]

۱۷۸۴ء میں Ingoldstandt یونی ورسٹی کا قانون کا ایک پروفیسر آدم وائزہاپٹ (Adam Weishaupt) مسیحیت سے منحرف ہو کر اس شیطانی فرقے کا رکن بن گیا۔ اس نے ''عہد قدیم'' کے ''پروٹوکولز'' کی تدوین نو کی اور کرۂ ارض پر شیطان کی حکومت کے قیام کے جدید طریق ہائے کار وضع کیے۔ وائزہاپٹ نے حکومت کی کارکردگی کو بہتر بنانے کا بہانہ بنا کر دو ہزار کے قریب اعلیٰ ترین ذہنی صلاحیتوں کے حامل افراد کو خطیر مشاہروں پر بھرتی کیا۔ یہ بہترین دماغ سائنس، طب، انجینئرنگ، آرٹس، معاشیات، انڈسٹری اور بزنس جیسے شعبوں سے تعلق رکھتے تھے اور دنیا میں ان کی ٹکر کے لوگ ملنا مشکل تھے۔ ان لوگوں کو خفیہ مراکز اور لاجز سے وابستہ کر کے ان کی اس طرح برین واشنگ کی کہ شیطانی آئیڈیالوجی ان کے رگ و پے میں رچ بس گئی۔ ان کو ''ایلیو میناٹی'' (Alluminati) کا نام دیا گیا جس کا معنی ہے ''روشنی والے یا مشعل بردار''!

ایلیو میناٹی کے قلب و نظر میں یہ عقیدہ راسخ کر دیا گیا کہ صرف وہی اس دنیا پر حکومت کرنے کا حق رکھتے ہیں کیونکہ وہ ذہنی اور فکری طور پر ساری دنیا کے انسانوں پر فائق ہیں۔ ایلیو میناٹی کے علاوہ باقی ساری دنیا کے لوگ ''گویم'' (Goyim) یعنی ''انسانی مویشی'' (Human Cattle) ہیں جن کا جان و مال ایلیو میناٹی پر حلال ہے۔ ایلیو میناٹی جس طرح چاہیں ساری دنیا کے وسائل پر قابض ہو سکتے ہیں، گویم کو غلام بنا سکتے ہیں، ان کی املاک اور وسائل پر قابض ہو سکتے ہیں، ان کا قتلِ عام کر کے یا بیماریاں پھیلا کر ان کی بڑی بڑی آبادیوں کو محدود اور مختصر کر سکتے ہیں۔

ایک عالمی حکومت کے قیام کے سلسلے میں جو منصوبہ تیار کیا گیا وہ کچھ یوں تھا:

(۱) تمام حکومتوں کے اہم اور صاحبِ اختیار و اقتدار افراد کو اپنی مٹھی میں کیا جائے۔ اس کے لیے خطیر رقوم بطور رشوت پیش کی جائیں۔ حسین اور ذہین عورتیں انھیں اپنے حسن و جمال کے جال میں پھنسا کر ان سے حساس اور اہم نوعیت کے راز حاصل کریں۔ جہاں ضروری ہو انھیں سیاسی اور سماجی طور پر بلیک میل کیا جائے، معاشی طور پر تباہ و برباد کر دینے کی دھمکی دی جائے یا موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

(۲) یونی ورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں ایسے خصوصی طور پر ذہین اور طبّاع طلبہ کا انتخاب کیا جائے جنھیں ایک عالمی حکومت کا خواب دکھا کر انھیں شیطانی منصوبوں پر عمل کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا جائے۔ انھیں قائل کیا جائے کہ دنیا میں مسلسل جنگ و جدل، ناانصافی، غربت، جہالت اور پسماندگی کا

خاتمہ صرف ایسی عالمی حکومت ہی کر سکتی ہے جو سائنسی، فنی، سماجی، سیاسی، اخلاقی اعتبار سے اہل ترین ہو۔ ایسے طلبہ کی تعلیم و تربیت کے لیے پرکشش وظائف اور دیگر مراعات مختص جائیں۔

(۳) ایلیومیناٹی، پریس اور دیگر تمام ایسی ایجنسیوں کا مکمل کنٹرول حاصل کریں جو عوام الناس تک اطلاعات پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔

(۴) تمام ممالک میں ایسے ماہرین، فنی معاونین اور مشیر بھیجے جائیں جو بظاہر اس ملک کی بہتری اور ترقی کے لیے کام کریں، لیکن در پردہ وہ عالمی سازشوں کا تانا بانا تیار کریں۔

اس بین الاقوامی تنظیم اور اس کے اغراض و مقاصد کا بعض حکومتوں کو پتا چل گیا۔ چنانچہ ان کے خفیہ مراکز پر چھاپے مارے گئے، ان کے اہم افراد کو گرفتار کیا گیا اور ان کے خفیہ ریکارڈ کو قبضے میں لے لیا گیا۔ لیکن ایلیومیناٹی اتنے طاقت ور اور با اثر ہو چکے تھے کہ حکومتوں کی کارروائیاں ان پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ انھوں نے زیرِ زمین رہ کے خفیہ طور پر اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ راتھ شائلڈ (Roth Schild) نے سرمایہ دارانہ معیشت اور سودی بنکنگ کو اتنا فروغ دیا کہ امریکہ اور برطانیہ جیسی حکومتیں بھی ایلیومیناٹی کی غلام بن کر رہ گئیں۔ یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ صرف فری میسن اور صہیونی (Zionists) ہی ایلیومیناٹی کے معیار پر پورے اترے اور ان کے نمایندے بنے۔[۲۶]

مذکورہ ''پروٹوکولز'' میں صہیونی اژدہے کی ایک تصویر دی گئی ہے جو پورے کرۂ ارض کو اپنی کنڈلی میں لے رہا ہے۔ وہ جن جن ممالک میں سے گذر رہا ہے وہاں کی معیشت کو تباہ کرتا اور امن و امان برباد کرتا جا رہا ہے۔ عالمی حکومت کے قیام کے سلسلے میں ہی بڑے بڑے انقلابات برپا کیے گئے اور دنیا پر عالمی جنگیں مسلط کی گئیں۔ پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں زارِ روس کی قوت کو توڑا گیا۔ خلافتِ عثمانیہ ختم کر کے مسلمانوں کی متعدد ''نیشن اسٹیٹس'' بنائی گئیں۔ شریف مکہ کو عرب ریاستوں کا شہنشاہ بنانے کا جھانسہ دیا گیا تھا، بعد میں اسے حجاز کی بادشاہی پر ٹرخا دیا گیا اور اس کے بیٹے کو عراق کا کٹھ پتلی حکمران بنا دیا گیا۔ ترکی، جرمنی اور آسٹریا کو ایسے معاہدوں پر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا جن کی شرائط انتہائی توہین آمیز تھیں۔ مصر، برطانیہ کی تحویل میں چلا گیا۔ شام و لبنان فرانس کی عمل داری میں دے دیے گئے۔ سلطنت آسٹریا کے حصے بخرے کر کے زیکوسلواکیا، ہنگری اور یوگوسلواکیا کی نئی مملکتیں پیدا کی گئیں۔ ترکی، بلغاریہ اور جرمنی کے اہم مقامات پر قبضہ کر کے ان کے وسائل پر تصرف حاصل کر لیا گیا اور ان ممالک پر بھاری جرمانے اور تاوان عاید کیے گئے۔

دوسری جنگ عظیم میں وہ مقاصد پورے کیے گئے جو جنگ عظیم اوّل میں ادھورے رہ گئے تھے۔ ان میں دو مقصد نمایاں تھے۔ نازی ازم کا خاتمہ اور اسرائیل کی صہیونی ریاست کا قیام! پھر دنیا تقریباً پون صدی

تک سرد جنگ کا شکار رہی جس کا خاتمہ سوویت یونین کے انہدام پر ہوا۔ دنیا میں ایک ہی عالمی قوت رہ گئی۔ اس کے مقابل کوئی حریف قوت نہ تھی جس سے یہ نبرد آزما ہوسکتی۔ چنانچہ نائن الیون کا ڈراما کر کے القاعدہ اور اسامہ بن لادن کا ہوّا کھڑا کیا گیا جسے جواز بنا کر امریکہ دنیا کے کسی ملک میں بھی اپنی فوجیں اتار سکتا ہے۔ یوں دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آڑ میں انھوں نے مختلف جگہوں پر اپنی فوجی کارروائیاں شروع کر دیں اور اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ دہشت گردی کے خلاف اس نام نہاد جنگ کا پہلا مقصد اسرائیل کی ریاست کا تحفظ اور اس کی توسیع ہے۔ دوسرا مقصد وسط ایشیا اور عرب ریاستوں کے وسائل پر قبضہ ہے۔ اس کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ چھوٹی نیشن اسٹیٹس کے مابین تضادات کو ہوا دے کر انھیں آپس میں لڑایا جائے تاکہ وہ معاشی، اخلاقی اور نفسیاتی طور پر اتنی کمزور اور مضمحل ہو جائیں کہ ان کے اندر سر اٹھانے کی سکت ہی نہ رہے۔ اس جنگ کا ایک اور مقصد یہ ہے کہ چین اور روس کے گرد گھیرا تنگ کیا جائے۔

یہ وہ ابلیسی منصوبہ ہے جس پر بڑے سوچے سمجھے اور ماہرانہ انداز میں عمل کیا جا رہا ہے۔ علامہ نے بڑی تفصیل سے ان فتنوں کا ذکر کیا ہے جو شیطانی قوتوں نے سرمایہ داری، ملوکیت، اشتراکیت، جمہوریت، فاشزم وغیرہ کے نام پر دنیا میں پھیلائے ہیں۔ علامہ نے ارمغان حجاز میں ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ابلیس کے ردعمل کا ذکر کیا ہے۔ ابلیس دنیا میں پھیلائے ہوئے اپنے فتنوں کا جائزہ لیتا ہے اور اطمینان کا اظہار کرتا ہے لیکن آنے والے وقت میں وہ اپنے اندیشوں کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اسے مستقبل میں صرف اسلام سے خطرہ ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اگر مستقبل میں کوئی عالمی حکومت قائم ہوگئی تو وہ صرف اسلام کی ہوگی جو دنیا پر شیطانی حکومت کے خواب کا تار و پود بکھیر دے گی۔

علامہ نے وطنیت اور قوم پرستی کو اسلام کی روح کے منافی قرار دیا ہے کیونکہ اس سے ایک طرف وطن اور قوم انسان کے لیے معبود کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں تو دوسری طرف اس سے تمام بنی نوع انسان کی ہدایت اور فلاح کا نصب العین ناممکن الحصول بن جاتا ہے۔ تاریخ اسلام پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلتا ہے کہ علاقائی، گروہی، نسلی اور لسانی تعصّبات نے مسلمانوں کو اکثر ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ خلافت عثمانیہ کو پارہ پارہ کر کے چھوٹی چھوٹی قومی ریاستیں بنانے میں دشمنوں نے اسے ایک خصوصی حربے کے طور پر استعمال کیا تھا۔

علامہ اس امر سے پوری طرح آگاہ تھے کہ قوم پرستی کے اندھے جذبے نے ملت اسلامیہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور اسلامی خلافت کی ٹھوس اور زندہ حقیقت کو ماضی کا خواب بنا دیا ہے۔ لہٰذا وہ سمجھتے ہیں کہ شاید اسلامی خلافت کا احیا اس کی روایتی شکل میں ممکن نہ ہو سکے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ استخلاف فی الارض کا منصوبۂ الٰہی ناکام ہو گیا ہے۔ زمین پر حکومت الٰہیہ کا قیام اور وحدتِ بشری کا آسمانی منصوبہ تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ اب بھی قابل عمل ہے اور شاید مشیت الٰہیہ بھی یہی ہے کہ اب یہ اس نئے انداز میں تکمیل پذیر ہو۔[۲۷]

علامہ اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور بین الاقوامی تقاضوں کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ اردگرد کے حالات پر مجتہدانہ انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خلافت یا امامت ضروری نہیں کہ فردِ واحد کو سونپی جائے۔ خلافت یا امامت کے اختیارات و فرائض نیک صالح اور قابل افراد کے ایک گروہ کو بھی تفویض کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ علامہ کے خیال میں ری پبلکن طرزِ حکومت نہ صرف یہ کہ موجودہ دور میں ازبس ضروری ہے بلکہ یہ اسلامی روح کے عین مطابق بھی ہے۔

اب جب کہ ملتِ اسلامیہ چھوٹی چھوٹی قومی ریاستوں میں منقسم ہو چکی ہے، اسے ایک واحد مرکزی پرچم تلے متحد کرنا ممکن نہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ہر اسلامی ریاست اپنا قومی تشخص برقرار رکھتے ہوئے دوسری اسلامی ریاستوں کے ساتھ ممکنہ حد تک اپنے لسانی، علاقائی اور سیاسی اختلافات کا تصفیہ کرے اور اپنی پوری توجہ اپنے داخلی استحکام پر مرکوز کر دے۔ اس کے بعد وہ سب مل کر اپنا ایک اتحاد تشکیل دیں۔ اس طرح خلافت کی بجائے ایک ''لیگ آف مسلم نیشنز'' وجود میں آئے گی جو اسلامی اتحاد اور اخوت کی ایک زندہ مثال ہوگی۔[۴۸]

اسی میں ماضی کی خلافت اور ملت اسلامیہ کا احیا ایک نئے انداز میں ہوگا۔

❁❁❁

حواشی و حوالہ جات

۱- بی۔اے۔ڈار (مرتب)، انوار اقبال، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۷۶-۱۷۸۔

2- Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, ed. M. Saeed Sheikh, Institute of Islamic Culture, Lahore, P.26.

۳- ایضاً۔

۴- کانٹ جب Phenomenon اور Noumenon کا ذکر کرتا ہے تو یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ شئے فی نفسہٖ یا Noumenon موجود ضرور ہے جو پراسرار علت کی حیثیت سے تحسّسات کا غیر مربوط شیرازہ ذہن میں پیدا کرتا ہے جس سے مظاہر Phenomena کی دنیا وجود پذیر ہوتی ہے۔

۵- خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۶۴۔

۶- علامہ محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (مترجم: نذیر نیازی)، بزم اقبال، لاہور، ص ۱۰۹-۱۱۰۔

7- Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, P.57.

۸- قطرہ چوں حرفِ خودی ازبر کند
ہستیِ بے مایہ را گوہر کند

۹- علامہ اس بات کے قائل نہیں کہ فرد اپنی ذات کی نفی کر کے حقیقت مطلقہ میں گم ہو جائے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ حقیقت مطلقہ یعنی صفات الٰہیہ (یا صبغۃ اللہ) کو اپنے اندر جذب کر لو۔ مومن وہ نہیں جو آفاق میں گم ہو بلکہ آفاق مومن میں گم ہوتے ہیں۔ ایسے تمام مذاہب اور فلسفے جو ذات، خودی یا انا کو موہوم یا 'مایا' قرار دیتے ہیں، باطل ہیں۔ ان کے نزدیک اثباتِ ذات اور استحکام خودی سب سے اہم صداقت ہے۔ البتہ صوفیانہ واردات میں جب صفاتِ الٰہیہ کا غلبہ ہوتا ہے تو انسانی خودی بہت حد تک دب جاتی ہے، تاہم معدوم نہیں ہوتی۔ رومی کے الفاظ میں لوہے کا بدرنگ اور زنگار آلود ٹکڑا جب آگ میں ڈالا جاتا ہے تو وہ اس حد تک تپ جاتا ہے کہ لپٹیں دینے لگتا ہے اور زبانِ حال سے ''من آتشم! من آتشم'' پکارتا ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی بطور لوہا اس کی انفرادیت برقرار رہتی ہے اور جب اس پر سے آگ کا غلبہ ختم ہو جاتا ہے تو لوہے کا ٹکڑا اسی طرح برقرار رہتا ہے۔ تاہم اس ''آتشی تجربے'' سے اس کی قلبِ ماہیت ہو جاتی ہے۔ اس کا زنگ اور بدرنگی ختم ہو جاتی ہے اور وہ پہلے سے زیادہ ٹھوس اور صیقل ہو جاتا ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ صوفیانہ واردات میں صفات الٰہیہ کا غلبہ و استیلا خودی کو معدوم نہیں کرتا بلکہ اسے استحکام بخشتا ہے اور اس کے اندر مثبت اور تخلیقی تبدیلیوں کا باعث بنتا ہے۔

۱۰- دنیا میں کئی طرح کے فلسفے اور طرز ہائے حیات پائے جاتے ہیں۔ بدھ فلسفہ زندگی اور اس کے تمام متعلقات کو غیر حقیقی اور ظنی قرار دیتا ہے اور نفی ذات کی تلقین کرتا ہے جس سے وہ نروان کی کیفیت سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ مسیحی رہبانیت بھی نفیِ ذات کی تلقین کرتی ہے۔ مسیحی مذہب کی ابتدائی صدیوں میں متعدد ایسے واقعات پیش آئے کہ سچے عیسائیوں نے اپنے مخالفین کے جور و جبر سے بچنے کے لیے شہروں کی سکونت ترک کر دی اور پہاڑوں کی غاروں اور گپھاؤں میں سکونت اختیار کر لی۔ اصحاب کہف کا واقعہ بھی ایسے ہی حالات کے تحت پیش آیا۔ (دیکھیے ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، جلد اوّل بذیل تفسیر سورۂ کہف)۔ بعدازاں رہبانیت کے باقاعدہ ادارے بن گئے اور یورپ کی اکثر آبادیوں میں ایسی الگ تھلگ عمارات تعمیر کی جانے لگیں جن میں عیسائی راہب اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک معتکف اور گوشہ نشین رہتے تھے۔ ایسی عمارتوں کو Logette کہا جاتا تھا۔ کھدائی کے دوران اس طرح کی عمارات بھی ملی ہیں جو چاروں طرف سے بند کمرے کی طرح تھیں اور ان میں صرف ایک چھوٹی کھڑکی ہوتی تھی۔ کوئی تارک الدنیا خود کو ایسے کمرے میں بند کر دیتا۔ کھڑکی کے راستے ہوا اندر آتی اور لوگ کچھ کھانے پینے کی اشیاء اندر ڈال دیتے۔ وہ شخص اس کمرے میں زندگی کے بقیہ ایام گذار دیتا۔ ان مقابر سے ایسے ڈھانچے بھی ملے ہیں۔ جو رکوع یا سجود کی حالت میں ہیں۔ ایسے لوگوں کا مشن اپنی ذات کی نفی تھا جس کی آخری شکل موت تھی۔ ایسے فلسفوں کا آغاز افلاطون کی تعلیمات سے ہوا جن کی رو سے انسانی جسم روح کا پنجرہ ہے جس سے نجات کی کوشش سب سے بڑی فضیلت ہے۔ پھر یہ فلسفے بدھ مت اور مسیحی تعلیمات میں مقبول ہوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ میں ایسے سیاہ ادوار بھی آئے جب صالحین کے لیے عزلت اور گوشہ نشینی کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا تھا۔

دورِ حاضر میں دو عالمی جنگوں کی ہولناک تباہی اور لاکھوں انسانوں کی ہلاکت و بربادی کے ردِعمل کے طور پر یورپ میں جو فلسفہ ابھرا اور مقبول ہوا اسے وجودیت (Existentialism) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس فلسفے نے ایسے تمام نظریات کا ابطال کر دیا جو کلیت پسند (Totalitarian) تھے اور فرد کے وجود پر حقیقت مجردہ یا ماہیت (Essence) کو مقدم سمجھتے تھے۔ وجودیت فرد کو اہمیت دیتی ہے اور اس ضمن میں فرد کی وجودی صورت حال (Predicament) پر زور دیتی ہے مثلاً خوف، دہشت، کرب، تنہائی، فرد کا فیصلہ وغیرہ۔

علامہ اقبال ایسے فلسفوں کی حمایت نہیں کرتے کیوں کہ ان سے زندگی کے حرکی اور تخلیقی تصور کی نفی ہوتی ہے۔

۱۱- علامہ محمد اقبال، ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر''، مقالات اقبال، مرتبہ: ایس اے واحد معینی، شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۱۱۸-۱۱۹۔

۱۲- ایضاً۔

۱۳- يَا اَيُّهَاالنَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كثيراً و نِسآءً (النساء:۱)

''اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کر کے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں''

ایک جان سے مراد ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا میں مِنْهَا سے وہی ''جان'' یعنی حضرت آدم علیہ السلام مراد ہیں یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے ان کی زوج (بیوی) حضرت حوا کو پیدا کیا۔ حضرت حوا حضرت آدم علیہ السلام سے کس طرح پیدا ہوئیں اس بارے میں حدیث ہے اِنّ الْمَرْاَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ (صحیح بخاری، کتاب دء الخلق) یعنی حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔

۱۴- مقالات اقبال، ص ۱۱۸-۱۱۹

15- Giddens Anthony, *Sociology*, 4th ed. 2004, Polity Press Cambridge C B2 I.U.R UK, P. 40.

16- Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, P.116.

۱۷- ایضاً۔

۱۸- مقالاتِ اقبال، ص ۱۲۰۔

۱۹- امتِ مسلمہ کے اسی کردار کی وضاحت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

لَاتَجِدُ قَوْماً يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوا دُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْا آبَآءَ هُمْ اَوْ ابْنآءَ هُمْ اَوْ اِخْوانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَ تَهُمْ اُوْلٰئِك حِزْبُ اللّٰهِ اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (المجادلہ:۲۲)

''تم ایسا ہرگز نہ پاؤ گے کہ کوئی جماعت اللہ اور یوم آخر پر ایمان بھی رکھتی ہو اور پھر اللہ اور رسول کے دشمنوں سے دوستی بھی رکھے خواہ وہ اس کے باپ بیٹے یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں یہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں..... اور جان رکھو کہ آخر کار اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔''

خدا کے دین کے دشمن خواہ وہ نصاریٰ ہوں، یہود ہوں، ہنود ہوں یا کسی اور مسلک سے تعلق رکھتے ہوں، اللہ کے نزدیک وہ شیطان کی ہی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں:

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ اُوْلٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ اَلَا اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (المجادلہ:۳)

''شیطان ان پر غالب آ گیا اور اس نے انھیں خدائی یاد سے غافل کر دیا۔ وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں اور جان رکھو کہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہی بالآخر ناکام و نامراد رہنے والے ہیں۔''

قرآن حکیم کے مطابق دنیا میں صرف دو ہی جماعتیں ہیں جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہی ہیں۔ ایک حزب اللہ جس کا مابہ الامتیاز نظریہ توحید ہے اور دوسری حزب الشیطان جو توحید کی منکر ہے۔

علامہ اقبال نے انھی دونوں پارٹیوں کو شاعرانہ علامتوں ''چراغِ مصطفوی'' اور ''شرار بولہبی'' سے تعبیر کیا ہے جن کی ستیزہ کاری ازل سے جاری ہے۔

۲۰- مقالاتِ اقبال، ص۱۲۰۔

۲۱- چشتی، محمد یوسف خاں سلیم، شرح اسرارِ خودی، اقبال اکیڈیمی، ظفر منزل، تاج پورہ، لاہور، سنہ ندارد۔

۲۲- قرآن مجید، سورہ البقرہ: ۳۹-۳۰۔

۲۳- اسی خلافت کے بارے میں رسول اللہؐ نے فرمایا تھا:

خِلَافَةُ النُّبُوَّةِ ثَلَاثُونَ سَنَةً

''یعنی خلافت علی منہاج النبوت تیس سال تک ہوگی۔'' (ابو داؤد: السنن، ۴:۲۱۱، طبع قاہرہ)

24- Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, P.119.

۲۵- ۱۷۸۴ء میں بویریا کی حکومت کے ہاتھ یہ خفیہ دستاویزات آئیں جن سے اس ابلیسی منصوبے کا انکشاف ہوا۔ ان دستاویزات کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ کس طرح ابلیس اور اس کے مقلدین صدیوں سے ایسی حکومت کے قیام کے لیے مرحلہ وار کوشش کرتے رہے ہیں۔ ان دستاویزات کا مطالعہ انٹرنیٹ پر اس عنوان کے تحت کیا جا سکتا ہے:

Protocols of the Learned Elders of Zion.

۲۶- اس ابلیسی منصوبے، عالمی حکومت کے قیام کے لیے بین الاقوامی سازشوں اور عالمگیر جنگوں کے پس پردہ کارفرما محرکات و عوامل کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے ملاحظہ کیجیے:

Car, William Guy, "Pawus in the Game". 1958, specially printed and bound for inclusion in American and European libraries.

27- Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, P.124.

۲۸- ایضاً، ص۱۲۶۔

علامہ نے ''لیگ آف مسلم نیشنز'' کے قیام کو جدید اسلام کا ایک اہم تقاضا قرار دیا ہے۔ اس کی (علامتی اور غیر فعال سہی) ایک شکل او۔ آئی۔ سی۔ کی صورت میں موجود ہے۔ مزید برآں ایسے بین الاقوامی اتحاد تشکیل دینا عصرِ حاضر میں اقوام عالم کی ضرورت بھی ہے اور چلن بھی۔ مثال کے طور پر آر۔ سی۔ ڈی۔ یورپین یونین اور شنگھائی کوآپریشن آرگنائزیشن کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

❁❁❁